جون 2003ء

تعلیم و تربیت

سالنامہ

چچا حیرت کی پانچوں گھی میں: ایک قہقہہ بار تحریر (صفحہ 17)

خونی دریا: شکاریات کے حوالے سے ایک انتہائی پر تجسس کی داستان (صفحہ 37)

پگلی ماں: دلوں پہ اثر کرنے والی ایک سبق آموز کہانی (صفحہ 14)

63واں سال۔ تیسرا شمارہ

پاکستان میں سب سے زیادہ پڑھا جانے والا

(رکن آل پاکستان نیوز پیپرز سوسائٹی)

تعلیم و تربیت

بچوں کا محبوب رسالہ

چیف ایڈیٹر
عبدالسلام

ایڈیٹر پبلشر
ظہیر سلام

مشیر خاص
سید مقبول حسین شاہ

مشیر
سعید لخت

اسسٹنٹ ایڈیٹر
محمد جاوید امتیازی

سید شوکت اعجاز

محمد بشیر راہی

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

السلام علیکم ورحمتہ اللہ!

اچھے بچو! کیسے ہیں آپ؟ اللہ کریم آپ کو ہر قدم' ہر آن خوش و خرم رکھے (آمین)

ہمیں پتا ہے کہ آپ لوگوں کو سالنامے کا بہت انتظار ہے' لیجیے انتظار کی گھڑیاں ختم اور ہنستا مسکراتا اور پھولوں کی طرح مہکتا' دمکتا "سالنامہ" آپ کے ہاتھوں میں آ گیا۔ یہ کیسا رہا؟ یہ تو آپ پڑھ کر ہی بتا سکیں گے۔ بہرحال اللہ کے فضل و کرم سے ہم نے اسے ہر طرح سے بنانے سنوارنے اور آپ بچوں کو تمام تر دلچسپیاں مہیا کرنے کی پوری کوشش کی ہے۔ ہمیں امید ہی نہیں بلکہ یقین ہے کہ آپ اپنے پیارے "تعلیم و تربیت" کو مزے مزے کی کہانیوں' معلوماتی اور سائنسی مضامین اور حیرتناک مہماتی واقعات کے ساتھ ساتھ انٹرویوز' پیغامات' معلومات' دلپذیر نظموں اور رنگارنگ تصاویر سے خوب مالا مال پائیں گے۔ یوں ہماری یہ امتیازی پیشکش آپ سب بچوں کے علاوہ آپ کے والدین کو بھی بے حد پسند آئے گی۔ اپنے تاثرات سے ضرور آگاہ کیجیے گا۔

اب ایک خوشخبری یہ بھی سن لیجیے کہ "تعلیم و تربیت" کے اقبالؒ نمبر (نومبر 2002) کو دعوۃ اکیڈمی' اسلام آباد کی طرف سے ملک بھر کے تمام رسالوں میں اول قرار دیا گیا ہے۔ اس کے علاوہ اسی میں شائع شدہ ایک نظم: اقبالؒ با صفا (امتیاز عارف) اور مضمون جاوید منزل (ڈاکٹر وحید عشرت) کو بھی اول انعام دیا گیا ہے۔ یہ سب اللہ کے فضل و کرم اور آپ بچوں کی دعاؤں کا نتیجہ ہے۔ ہماری طرف سے آپ کو ڈھیروں مبارکباد!

موسم گرما کی چھٹیوں کی آمد آمد ہے۔ ان چھٹیوں میں خوب لکھیے پڑھیے اور محنت کیجیے' گرمی میں باہر نکلنے یا خواہ مخواہ ادھر ادھر گھومنے کی ضرورت نہیں۔ اپنی صحت کا خیال رکھیے۔ ایسے میں "تعلیم و تربیت" کا مطالعہ یقیناً تعطیلات کے مزے دوبالا کر دے گا۔ خدا آپ کو خوش رکھے' ہزاروں' لاکھوں دعاؤں کے ساتھ..... اڈیٹر

اس شمارے میں

دعا ...	حکیم افتخار فخر	2
درس قرآن	ڈاکٹر عبدالرؤف	3
صلی اللہ علیہ وسلم	ابوالمدنی	4
تعلیم و تربیت (نظم)	محمد امتیاز عارف	6
انعامی تالا	نذیر انبالوی	8
پگلی ماں	عالیہ بخاری ہالہ	14
بچپن مجھے عزیز ہے!	احمد ندیم قاسمی	16
چچا حیرت کی پانچوں گھی میں	محمد ادریس قریشی	17
نیل شیر	حامد مشہود	21
چور کون؟	سعید لخت	24
ہر فن مولا (روبوٹ کہانی)	حسن ذکی کاظمی	29
پیارے بچوں کے نام	امجد اسلام امجد	32
...دریا	جنید احمد	37
... تجربے	سید شوکت اعجاز	44
... (نظم)	ضیاء الحسن ضیاء	46
ماہی برکتے	محمد فاروق دانش	47
کراچی شہر بے مثال (نظم)	ناصر زیدی	52
صحراؤں کی سرزمین (6)	ڈاکٹر محمد اقبال ثاقب	53
صحت (نظم)	کرامت بخاری	60
چڑی مار	علی اکمل تصور	61
ایک بڑا انسان	سید محمد جاوید امتیازی	67
جیک اور دھوکے باز دیو	پروفیسر سلیم احمد صدیقی	68
کیوں برا لگتا تھا بھی؟	مجیب ظفر انوار حمیدی	75
ڈاکٹر عطاء الرحمان	غلام حسین بھمن	80
گھاس (سائنس کی دنیا)	عبدالحمید عابد	82
نیٹ ورک (6)	منظر رضا ہاشمی	84

اور بہت سے دوسرے دلچسپ سلسلے

سرورق: سالنامہ 2003

آئندہ شمارے میں

ساتھیو آپ کو معلوم ہے کہ سالِ رواں 2003ء کو مادرِ ملت محترمہ فاطمہ جناحؒ کا سال قرار دیا گیا ہے۔ لہٰذا اس حوالے سے اگلا شمارہ خاص نمبر ہو گا۔ مادرِ ملتؒ کے بارے میں بہت ساری معلومات' نظموں اور تاریخی یادگار واقعات سے بھرپور..... بالکل منفرد اسلوب اور انداز کے ساتھ' ان شاء اللہ!

جون 2003ء

قیمت فی رسالہ: 20 روپے

ماہنامہ تعلیم و تربیت 32۔ایمپریس روڈ' لاہور
U.A.N: 042-111-62-62-62 Fax: 042-6369204
Email: support@ferozsons.com.pk
Website: http://www.taleemotarbiat.com

...خریدار بننے کے لیے سال بھر کے شماروں کی قیمت بنک ڈرافٹ' چیک یا منی آرڈر کی صورت ...سرکولیشن منیجر ماہنامہ تعلیم و تربیت 32۔ایمپریس روڈ' لاہور کے پتہ پر ارسال کریں۔
فون: 6278815-6361310-6361309 فیکس: 6278816

پاکستان میں (صرف رجسٹری کے ساتھ) =/345 روپے۔
مشرق وسطیٰ اور افریقہ (ہوائی ڈاک سے) =750 روپے۔
یورپ (ہوائی ڈاک سے) =830 روپے۔
امریکا اور مشرق بعید (ہوائی ڈاک سے) =950 روپے۔

پرنٹر: عبدالسلام۔ مطبوعہ فیروز سنز (پرائیویٹ) لمیٹڈ لاہور
سرکولیشن اور اکاؤنٹس: 60۔شاہراہ قائداعظم لاہور

دعا

حکیم افتخار فخر

معروف ادیب اور شاعر

گزشتہ 40 سال سے شعر و ادب کی دنیا سے وابستہ ہیں۔ ان کی دلپذیر نظمیں "تعلیم و تربیت" کے قارئین شوق سے پڑھتے ہیں۔

اے خالقِ حقیقی سن لے دعا ہماری
پہنچے فلک پہ اب تو یہ التجا ہماری

نیکی سے ہم کو کر دے تو مالا مال مولا
روشن ترین ہوں سب دن، ماہ و سال مولا

چھوٹے بڑوں کی عزت دل جان سے کریں ہم
سب بھائی بھائی بن کر آپس میں بانٹ لیں غم

اخلاق بھی ہو اونچا، کردار بھی ہو اونچا
اسلاف کا دکھادے یارب ہمیں تو رستہ

دکھ درد میں سبھی کے ہم کام آئیں یارب
ہرگز نہ ہم پہ درد و آلام آئیں یارب

تاروں کا نور بن کر گل کا جمال بن کر
زندہ رہیں جہاں میں روشن مثال بن کر

سینے میں بجلیاں ہوں، سوزِ دروں عطا کر
عقل و خرد عطا کر، جذب و جنوں عطا کر

تجھ ہی سے مانگتے ہیں علم و ہنر عطا کر
مومن کی آنکھ والی اونچی نظر عطا کر

اونچا ہے نام تیرا اونچا مقام تیرا
اپنا ہر اک سویرا ہو نور کا سویرا

جامع مقام تو ہے عالی صفات تو ہے
جو فخر کے ہے لائق وہ ایک ذات تو ہے

خالق: بنانے والا　فلک: آسمان　اسلاف: ہمارے بزرگ، باپ دادا　سوزِ دروں: قلبی ذوق و شوق　عقل و خرد: دانائی
جذب و جنوں: جذبہ، لگن　جامع مقام: بڑے رتبے والا　عالی صفات: بڑی خوبیوں والا

درس قرآن

بہترین نمونہ

دوسری قسط

ڈاکٹر عبدالرؤف

پچھلی قسط میں ہم نے آنحضورﷺ کے چیدہ چیدہ اوصاف کا ذکر کیا تھا' جن کی بنا پر انہیں انسانیت کا بہترین نمونہ قرار دیا گیا ہے۔ اس قسط میں سرور کائناتﷺ کے چند اور قابل تعریف محاسن کا ذکر کیا جا رہا ہے۔

بہترین مدبر: آپ ایک مانے ہوئے دانشمند مدبر تھے۔ اس کے صرف چند ثبوت یہ ہیں۔ (1) حجر اسود کے ہنگامے کا دانشمندانہ تصفیہ (2) مدینہ منورہ میں انصار اور مہاجرین کے درمیان مواخات (اسلامی بھائی چارہ) کا مدبرانہ اقدام (3) میثاق مدینہ میں مدبرانہ بصیرت کا مظاہرہ (4) صلح حدیبیہ میں خداداد فہم و تدبر کا ثبوت (5) فتح مکہ پر جانی دشمنوں سے بے مثال فراخ دلی کا سلوک (6) الوداعی حج کے دوران میدان عرفات میں انسانی حقوق کے منشور اعظم کا اعلان۔

بہترین حکمران: سرور کائناتﷺ ایک عظیم الشان مثالی اسلامی ریاست کے مثالی سربراہ ثابت ہوئے۔ آپ کا حکومتی فلسفہ یہ تھا کہ "قوم کا سردار ان کا خادم ہوتا ہے"۔

بہترین قانون ساز: زندگی میں نظم و نسق کے فروغ اور انسانی فلاح و بہبود کے لیے آنحضورﷺ کی قانون سازی بھی عدیم النظیر مقام رکھتی ہے۔

بہترین منصف: عدل و انصاف کے شعبے میں بھی آنحضورﷺ اپنی مثال آپ تھے۔ رسالت مآبؐ نے صحیح منصف کی ایک ایسی درخشندہ مثال پیش کی ہے جس کا دوست دشمن سبھی اعتراف و احترام کرتے تھے۔

بہترین کارکن: آنحضورؐ محنت و مشقت اور حرکت و عمل کے میدان میں بھی ایک شاندار مثال تھے۔ مسجد قبا' مسجد نبوی کی تعمیر اور غزوہ خندق کے دوران اپنے ساتھیوں کے شانہ بشانہ مزدوری کے مسلسل مظاہروں سے بھی آپؐ نے ثابت کر دکھایا کہ آپؐ اعلیٰ پایہ کے مشقت پسند مزدور بھی ہیں۔

(مسلسل۔ باقی آئندہ قسط میں)

صلی اللہ علیہ وسلم

ابو المدنی

پیارے نبی ﷺ کا اخلاق دیکھئے' کیسا پیارا اخلاق تھا آپ کا' سبحان اللہ! جس طرح اخلاق کا مظاہرہ گھر میں کرتے تھے ویسی ہی محبت و شفقت اور رحمت و مہربانی گھر سے باہر بھی فرماتے تھے۔ حتیٰ کہ غلاموں' نوکروں کے ساتھ بھی ویسے ہی اخلاق سے پیش آتے تھے۔ اُس زمانے میں ایک زر خرید غلام ہوتا تھا یعنی اسے پیسے دے کر خرید لیا جاتا تھا۔ پھر وہ غلام بھاگ نہیں سکتا تھا۔ چاہے اس کے ساتھ جیسا مرضی سلوک کیا جائے۔ عرب میں غلاموں کے ساتھ جانوروں سے بھی بدتر سلوک کیا جاتا تھا اور یہ مکروہ سلسلہ صدیوں سے نسل در نسل جاری تھا۔

سراپا رحمت' سراپا شفقت نبی ﷺ

سید عالم ﷺ کے پاس بھی ایک غلام تھا۔ جن کا نام زید بن حارث تھا۔ یہ اپنے ماں باپ کے چہیتے بیٹے تھے۔ ان کو کسی طرح ایک بردہ فروش نے پکڑ کر بیچ دیا اور آخر کار پیارے نبی ﷺ کے پاس پہنچ گئے۔ ان کے گھر والوں کو پتا چلا کہ ہمارا بیٹا زندہ ہے تو وہ مکہ معظمہ میں آئے اور آپ ﷺ کی خدمت میں حاضر ہوئے۔

ننھے ساتھیو! ذرا سوچیں کہ اگر کوئی بچہ اپنے گھر والوں سے جدا ہو اور پھر اچانک اس کے وارث یعنی ماں باپ آجائیں تو پھر اس بچے کی کیا حالت ہو گی۔ وہ سینے سے چمٹ جائے گا اور کہنے لگے گا کہ: مجھے یہاں سے جلدی لے چلو' مجھے گھر جانا ہے۔ دیکھئے' زید بن حارث کے والدین آئے ہوئے ہیں اور زید انکار کر رہے ہیں کہ: "میں نے تمہارے ساتھ نہیں جانا۔ میں نے آنحضور ﷺ ہی کی بارگاہ میں رہنا ہے۔ مجھے آزادی نہیں چاہیے۔ مجھے آپؐ کی غلامی چاہیے! مجھے ماں باپ کا پیار نہیں ملا لیکن جسے رحمت عالم ﷺ کا پیار مل جائے' پھر اُسے کسی اور پیار کی کیا ضرورت ہے! لہٰذا میں تمہارے ساتھ نہیں جاؤں گا"۔ یہ سن کر آنحضور ﷺ نے فرمایا کہ اگر یہ آپ لوگوں کے ساتھ جانا چاہے تو میں اس کو روکوں گا نہیں اور اگر یہ جانا نہ چاہے تو میں اس کو اپنے سے جدا نہیں کروں گا۔

یہ تھا حضور ﷺ کا پیارا اخلاق اور کردار۔ اس کا نتیجہ یہ نکلا کہ جب آپؐ نے اسلام کی دعوت دی تو غلاموں میں سب سے پہلے جس نے اسلام قبول کیا وہ حضرت زید بن حارثؓ ہی تھے۔ بلاشبہ آنحضور ﷺ کا اعلیٰ و افضل اخلاق بے مثل تھا' ویسا تو کسی کا ہو ہی نہیں سکتا!

حسنِ خلق

مکہ معظمہ میں پیارے نبی ﷺ ایک مرتبہ رات کے وقت راستے میں تھے کہ کیا دیکھتے ہیں کہ ایک بڑھیا سامان کی گٹھڑی باندھے دروازے میں کھڑی ہے۔ آنحضور ﷺ اس کے پاس تشریف لے گئے اور اُس سے پوچھا: مائی صاحبہ یہاں کھڑی ہو' کیا بات ہے؟ وہ کہنے لگی: بیٹا! میں نے سنا ہے کہ مکہ میں کوئی جادوگر آیا ہے۔ اس نے نبوت کا دعویٰ بھی کیا ہے۔ سنا ہے کہ وہ ایسا جادوگر ہے کہ جو کوئی ایک دفعہ اس کی بات سن لیتا ہے' اس کا

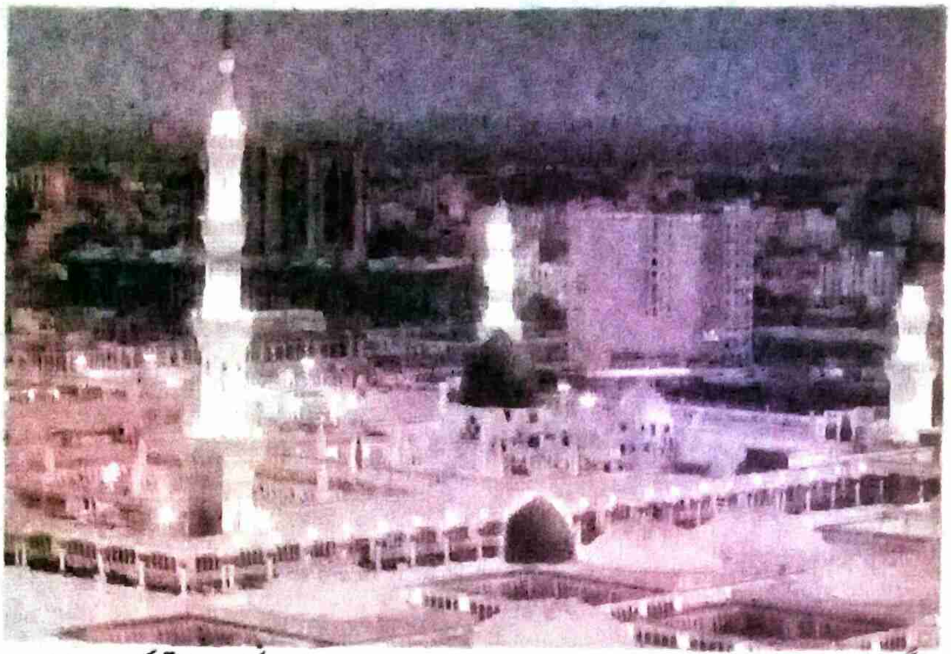

گرویدہ ہو جاتا ہے اور اپنے ماں باپ کا مذہب چھوڑ دیتا ہے۔ میں نہیں چاہتی کہ اپنے باپ دادا کا مذہب چھوڑوں۔ لہٰذا میں نے فیصلہ کر لیا ہے کہ میں یہ شہر ہی چھوڑ دوں گی لیکن باپ دادا کا مذہب نہیں چھوڑوں گی۔

پیارے نبی ﷺ مسکرائے اور فرمانے لگے: اب کیا بات ہے، کیوں کھڑی ہو؟ کہنے لگی: سوچ رہی ہوں کہ کوئی آئے اور میرا سامان اٹھا کر مجھے چھوڑ آئے کیونکہ میری اولاد نہیں ہے۔ آپؐ نے فرمایا: کسی کا کیوں انتظار کرنا، میں تمہارا سامان اٹھا لیتا ہوں۔ آپؐ نے یہ فرمایا اور مائی کی گٹھڑی سر پر اٹھا کر اس کے ساتھ چلنے لگے۔

بچو، ذرا سوچیے تو! پیارے نبی ﷺ تشریف لے جا رہے ہیں اور گٹھڑی سر اقدس پر رکھی ہے، چلے جا رہے ہیں۔ ایک جگہ پر جا کر بڑھیا نے کہا کہ بس، اِدھر میرا سامان اتار دو۔ آپؐ نے سارا سامان اتار دیا۔ جب واپس پلٹنے لگے تو بڑھیا نے آواز دی۔ فرمایا کیا بات ہے؟ کہنے لگی: بیٹا! تیری صورت بڑی پیاری ہے اور موہنی سی ہے۔ مجھے ڈر ہے کہ کہیں تجھ پر بھی اُس جادوگر کا اثر نہ ہو جائے۔ اُس سے بچ کر رہنا! آپؐ نے فرمایا: مائی اس جادوگر کا نام کیا ہے۔ کہنے لگی، سنا ہے اس کا نام محمد (ﷺ) ہے! فرمانے لگے: مائی! وہ محمدؐ میں ہی ہوں۔ یہ سن کر بڑھیا نے کہا: اچھا تو پھر میری یہ گٹھڑی اٹھا اور جہاں سے لایا ہے وہیں چھوڑ آ! "وہ کیوں" آپؐ نے اس سے پوچھا تو کہنے لگی: اس لیے کہ میں بھی کلمہ پڑھ کر مسلمان ہو جانا چاہتی ہوں۔ سبحان اللہ! یہ ہے اخلاق و کردار کی عظمت اور اس کا اثر!

سلام اُسؐ پر کہ جس نے خوں کے پیاسوں کو قبائیں دیں!
سلام اُسؐ پر کہ جس نے گالیاں سن کر دعائیں دیں!

آیئے ہم بھی پیارے نبی ﷺ کی سچی پیروی کرتے ہوئے اخلاقِ نبویؐ اپنانے کی دل و جان سے کوشش کریں۔ حسنِ اخلاق ہی وہ اصل زیور جس سے آراستہ پیراستہ ہو کر انسان نہ صرف دنیا میں ترقی کی منزلیں طے کر سکتا ہے بلکہ خالقِ کائنات کی رضا اور خوشنودی حاصل کر کے ہر قدم پر کامیاب و سرفراز ہو سکتا ہے۔ آنحضور ﷺ کا حسنِ سلوک اور اعلیٰ اخلاق بلکہ آپؐ کی ساری کی ساری زندگی ہم سب کے لیے بہترین نمونہ ہے۔ ہمارا اٹھنا بیٹھنا، کھانا پینا، سونا جاگنا بلکہ زندگی کا ہر قدم اور ہر حرکت اسوہ رسول ﷺ کے مطابق ہونی چاہیے۔ اسی میں کامیابی کا راز پوشیدہ ہے۔

تعلیم و تربیت

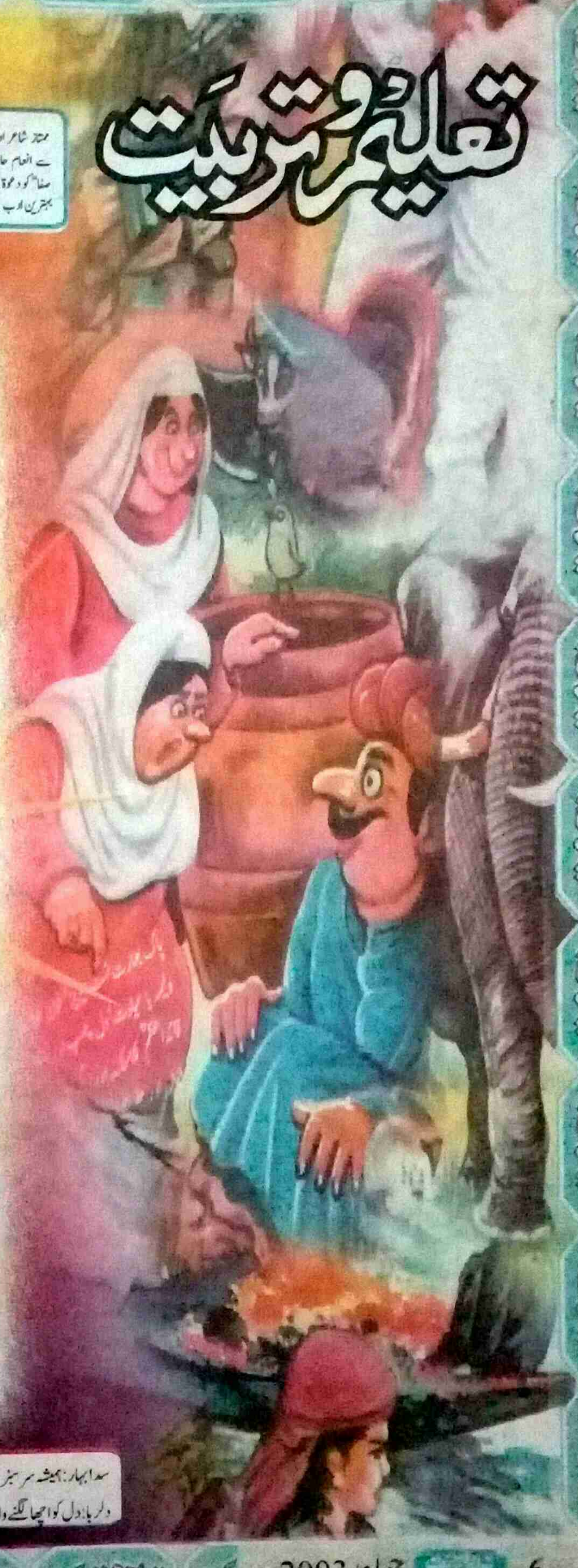

محمد امتیاز عارف

ممتاز شاعر اور ادیب' 2000ء میں نیشنل بک فاؤنڈیشن سے بچوں کی نظموں کے حوالے سے انعام حاصل کیا۔ "تعلیم و تربیت" اقبال نمبر میں شائع ہونے والی ان کی نظم: "اقبال با صفا" کو دعوۃ اکیڈمی اسلام آباد نے اول قرار دیا ہے۔ گزشتہ چالیس سال سے بچوں کے لیے بہترین ادب تخلیق کر رہے ہیں۔

"تعلیم و تربیت" ہے رسالہ سدا بہار
علم و ادب کا اپنے زمانے میں شاہکار

اس کے مطالعے سے بڑھے علم و آگہی
ہوتے ہیں زندگی کے نئے راز آشکار

درس قرآن ہو کہ ہوں نظمیں' کہانیاں
اس کا ہر انتخاب ہے دلچسپ و شاندار

رنگین و دلربا و حسیں اس کا ہر صفحہ
دیکھے سے دل کو چین ملے' روح کو قرار

باسٹھ برس مسلسل اشاعت کے ہو گئے
بچے ہوں یا بڑے سبھی کرتے ہیں اس سے پیار

یوں تو ہیں اس کے عام شمارے بھی مثلِ خاص
اب کے برس کا خاص شمارہ ہے یادگار

یارب ! دعا ہے پھولتا پھلتا رہے یونہی
"تعلیم و تربیت" کا بڑھے روز و شب نکھار

سدابہار: ہمیشہ سرسبز رہنے والا	شاہکار: اعلیٰ نمونہ	آگہی: واقفیت	آشکار: نمایاں ہونا
دلربا: دل کو اچھا لگنے والا	چین: آرام، خوشی	قرار: سکون	نکھار: چمک دمک

بچوں کے نام مشاہیر کے پیغام!

تعلیم و تربیت

جناب عبدالعزیز خالد

بچے ہمارا مستقبل ہیں' ان کی صحیح اور راست تعلیم و تربیت کا اہتمام ہمارے ملکی و قومی استحکام اور ترقی و منزلت کی اصل ضمانت ہے۔ بچوں کی کردار سازی اور تعمیر سیرت کے حوالے سے جب بھی بات کی جائے گی' ماہنامہ ''تعلیم و تربیت'' کی خدمات کو ضرور سراہا جائے گا۔ میرے لیے یہ امر اور بھی خوشی اور طمانیت کا باعث ہے کہ میری اولین تحریر بچوں کے اسی عہد ساز رسالے میں شائع ہوئی تھی۔ یہ برسوں پہلے کی بات ہے۔ تعلیم و تربیت کی جو شمع آپ نے روشن کی ہے' اس کی کرنیں اخلاق و کردار کے بصیرت افروز آہنگ میں ہمارے اس رخشندہ و تابندہ مستقبل کی بجا طور پر صورت گری کر رہی ہیں۔

بچوں کے لیے اور خاص طور پر ''تعلیم و تربیت'' کے ننھے ہونہار قارئین کے لیے میرا یہی پیغام ہے کہ وہ ہمیشہ وقت کی قدر کریں' اپنے ملک سے پیار کریں اور تعلیم کے میدان میں خوب آگے بڑھیں۔ محنت' کوشش اور لگن کو اپنا وظیفہ حیات بنائیں اور اعلیٰ سیرت و کردار کی مثال پیش کریں۔

خدا آپ کا حامی و ناصر ہو۔ سالنامے کی بہت بہت مبارکباد! (14 مئی 2003)

جناب سعید لخت

کر سیوا' کھا میوہ!

بزرگوں کی عزت و خدمت کرو۔ ان کے قدم چومو۔ کامیابی تمہارے قدم چومے گی۔ (2 مئی 2003ء)

جناب ڈاکٹر عبدالرؤف

انسانی شخصیت و کردار تعمیری اور تخلیقی فکر و عمل سے بنتے ہیں۔ تعمیری فکر و عمل قرآنِ حکیم اور اسوءِ حسنہ کی تعمیل ہی سے ممکن ہے۔ (11 ربیع الاول 1424ھ)

شعبہ تعلیم سے وابستہ بچوں کے ادب کے حوالے سے ایک جانا پہچانا نام۔ کئی کتابوں پر نیشنل بک فاؤنڈیشن ایوارڈ حاصل کر چکے ہیں۔ آپ کی کہانیاں نہایت دلچسپ اور سبق آموز ہوتی ہیں۔

نذیر انبالوی

انعامی تالا

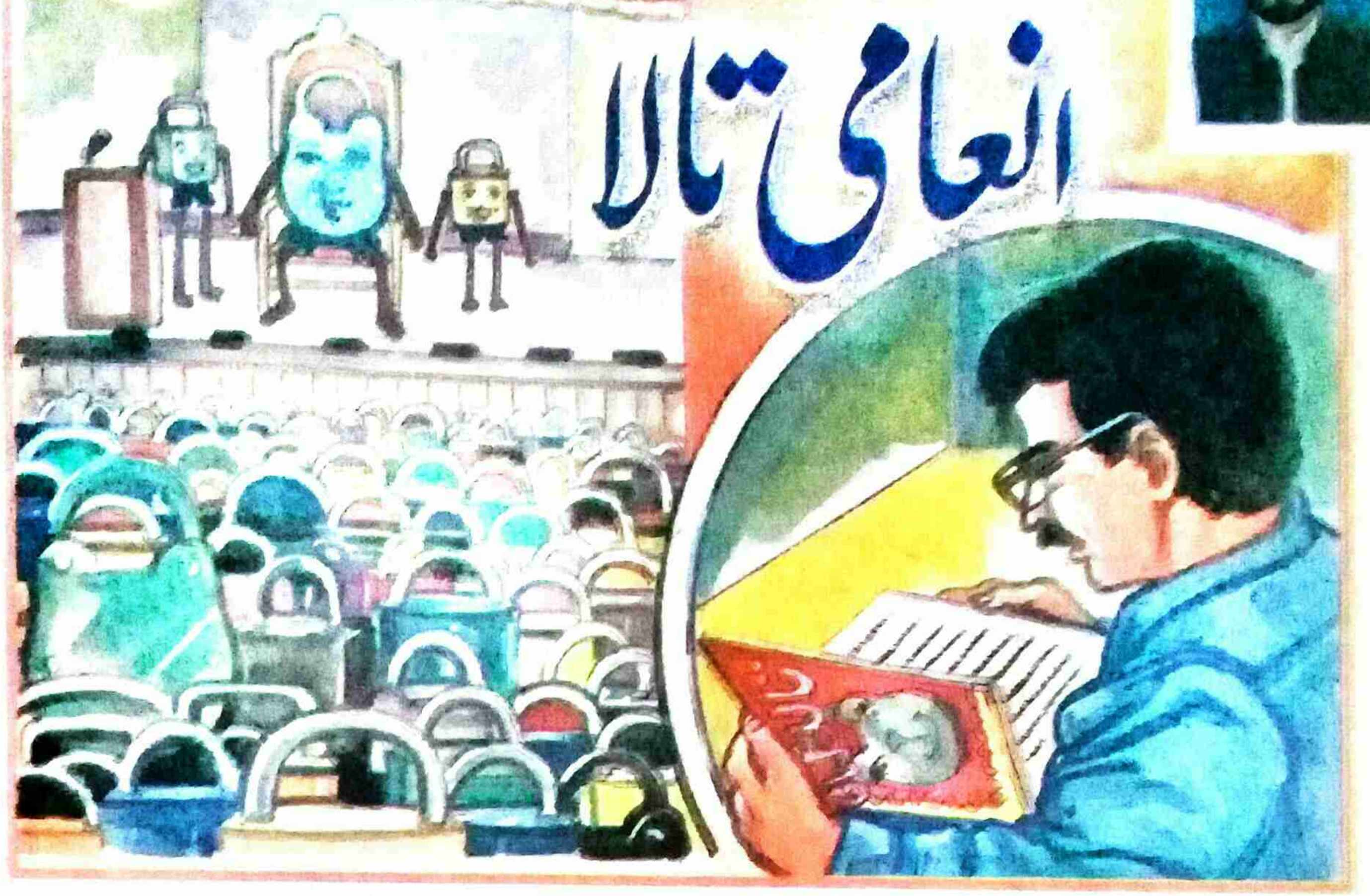

تالا نگر میں حد نظر تک تالے ہی تالے دکھائی دے رہے تھے۔ یہاں پہلی بار ایک انعامی تقریب کا انعقاد کیا گیا تھا۔ ایک وسیع و عریض میدان میں بڑا سا اسٹیج بنایا گیا تھا جس پر خوبصورت کرسیاں رکھی گئی تھیں۔ اسٹیج کے پیچھے ایک بڑے سے بینر پر موٹے موٹے حروف میں لکھا ہوا تھا: "دنیا کے کونے کونے سے آنے والے تالوں کو خوش آمدید"۔

سب تالوں کی نظریں اسٹیج پر جمی ہوئی تھیں۔ پنڈال میں پوری دنیا سے آئے ہوئے تالے موجود تھے۔ نئے پرانے، چھوٹے بڑے، مختلف رنگوں والے، دروازوں، تجوریوں، موٹر سائیکلوں، کاروں، الماریوں، سائیکلوں اور میزوں کی درازوں کے بے شمار تالے اپنے اپنے کارنامے بتانے کے لیے بے تاب دکھائی دے رہے تھے۔ ایک بڑا سا تالا پنڈال میں داخل ہوا تو ہر طرف سرگوشیاں ہونے لگیں:

"اس بار انعام اسی تالے کو ملے گا"۔ ایک تالا بولا۔

"وہ کیوں؟" دوسرے تالے نے پوچھا۔

"وہ اس لیے کہ یہ دنیا کا سب سے بڑا تالا ہے"۔

"کسی کے بڑے یا چھوٹے ہونے سے کیا ہوتا ہے"۔

دونوں تالے سرگوشیوں میں مصروف تھے۔ جب اسٹیج پر سردار تالا آیا تو پنڈال میں مکمل خاموشی چھا گئی۔ سردار تالا جونہی اپنی کرسی پر بیٹھا ایک تالے نے نہایت ادب سے کہا:

"سردار اگر اجازت ہو تو کاروائی کا آغاز کیا جائے"۔

"اجازت ہے" سردار تالا بولا۔

اجازت ملتے ہی تالا مائیک پر آکر بولا: "پیارے تالو! جیسا کہ آپ کے علم میں ہے کہ آج تالا نگر میں ہم سب کے جمع ہونے کا مقصد یہ ہے کہ آپ باری باری سال بھر میں اپنے کاموں سے سردار تالا کو آگاہ کریں تاکہ یہ فیصلہ کیا جا سکے کہ سال کے بہترین تالے کا انعام کسے دیا جائے۔ انعامی تالے کا فیصلہ کرنے کے لیے تین تجربہ کار تالوں کی جیوری تشکیل دی گئی ہے۔ میں آپ کی تالیوں میں تینوں تجربہ کار تالوں کو اسٹیج پر آنے کی دعوت دیتا ہوں"۔

چند ساعتوں بعد تین تالے اپنی اپنی کرسی پر تشریف لے آئے۔ کمپیئر تالے نے کہا: "میرے پاس مختلف ممالک سے آئے ہوئے تالوں کی تفصیل موجود ہے۔ میں اب تالا نمبر ایک کو بلا رہا ہوں یہ اپنا کارنامہ سنائیں گے۔ اپنا نمبر سن کر ایک موٹا سا تالا بھیڑ کو چیرتا ہوا اسٹیج کی طرف بڑھا۔ اس نے گلا صاف کرتے ہوئے کہا:

"میں ایک بینک میں رکھی تجوری کا تالا ہوں۔ تین ماہ پہلے دن کے وقت جب بینک میں روپے کا لین دین جاری تھا اچانک چھ ڈاکو بینک میں داخل ہوئے۔ انہوں نے آتے ہی بینک کے پورے عملے اور لوگوں پر اسلحہ تان لیا۔ ایک ڈاکو نے بینک کے گن مین کو قابو کیا اور باقی ڈاکوؤں نے کیشئر سے روپے چھین کر ایک تھیلے میں ڈالے اور فرار ہو گئے۔ بینک میں رکھی تجوری پر میری موجودگی کی وجہ سے ڈاکو اس میں رکھے زیورات اور کرنسی نہ لوٹ سکے۔ میں سارا سال بینک میں اربوں روپوں کی حفاظت کرتا رہا ہوں۔ اس لیے انعام کا حق دار میں ہوں"۔

اس کے بعد تالا نمبر دو کو اسٹیج پر بلایا۔ تالا نمبر دو نے اپنی بات اس طرح شروع کی: "جناب! میں ایک پبلک لائبریری کا تالا ہوں۔ میں نے لائبریری میں موجود لاکھوں کتابوں کی سال بھر حفاظت کی ہے۔ ہزاروں لوگوں نے اِن کتابوں سے اپنے علم کی پیاس بجھائی ہے۔ جب سب لوگ چلے جاتے ہیں تو کتابوں کا خزانہ میری نگرانی میں ہوتا ہے۔ میرا خیال ہے کہ میں انعام کا مستحق ہوں"۔

تالا نمبر دو کے اتنا کہنے کی دیر تھی کہ دنیا بھر کی لائبریریوں سے آئے ہوئے تالے اٹھ کھڑے ہوئے۔ ان تالوں نے بھی سال بھر کتابوں کی حفاظت کی تھی۔ جیوری کے تینوں ارکان اپنی اپنی فائل میں کچھ لکھتے جا رہے تھے۔ جب ذرا شور کم ہوا تو کمپیئر نے تالا نمبر تین کو بولنے کا موقع دیا۔ ایک چھوٹے سے گول تالے نے سب کو مخاطب کیا: "میں ایک فریج کا تالا ہوں۔ میری مالکن کبھی کبھار ہی مجھے اپنی خدمت کا موقع دیتی ہے۔ میں جب کھلا ہوتا ہوں تو میری مالکن کے چھوٹے بیٹے پپو کی موج ہو جاتی ہے۔ وہ فریج میں رکھی چیزوں پر خوب ہاتھ صاف کرتا ہے۔ جب اس کی امی اس سے فریج میں موجود چیزوں کے بارے میں پوچھتی ہے تو وہ فوراً جھوٹ بول دیتا ہے کہ اس نے وہ چیزیں نہیں کھائیں۔ میری مالکن نے جب دیکھا کہ پپو کسی طرح بھی فریج سے چوری کرنے سے باز نہیں آ رہا تو اس نے مجھے نگرانی پر مامور کر دیا۔ میں جب نگرانی پر بیٹھا تو ایک دن پپو چپکے سے فریج کی طرف بڑھا۔ فریج میں مزے دار آم رکھے تھے۔ میرے ہوتے ہوئے پپو کس طرح آم چرا سکتا تھا۔ پپو نے فریج کا دروازہ کھولنا چاہا مگر مجھے دیکھ کر وہ مایوس ہو گیا۔ میری وجہ سے پپو چوری جیسے برے کام سے بچ گیا۔ میں نے پپو کو چوری سے بچایا ہے اس لیے انعام مجھے ملنا چاہیے"۔

اب تالا نمبر چار کی باری تھی۔ اس نے مائیک پر آتے ہی کہا: "حضور والا! میں ایک کار کا تالا ہوں۔ میرے مالک نے بینک سے قرض لے کر ایک کار خریدی ہے۔ وہ اپنی تنخواہ سے کچھ روپے بچا کر بینک کی ماہوار قسط ادا کرتا ہے۔ چند مہینوں پہلے وہ ایک ضروری کام سے کار کو باغ کے قریب کھڑا کر کے ایک دفتر میں چلا گیا۔ ایک کار چور موقع کی تلاش میں تھا۔ اس نے مجھے کھولنے کی کوشش کی مگر وہ کامیاب نہ ہو سکا۔ میری وجہ سے میرا مالک لاکھوں کے نقصان سے بچ گیا۔ میرا یہ کارنامہ ہی مجھے انعام کا حق دار بنانے کے لیے کافی ہے"۔

اس بات پر کاروں کے تالے کب چپ رہنے والے تھے۔ وہ بھی سال بھر اپنے مالکوں کی کاروں کی حفاظت کر رہے تھے۔

پنڈال میں اس وقت خاموشی ہوئی جب تالا نمبر پانچ نے اپنی بات کا آغاز کیا۔

"میں ایک جیولری مارکیٹ کے بڑے دروازے کا تالا ہوں۔ مارکیٹ میں کل پچاس جیولری کی دکانیں ہیں۔ ہر دکان سونے سے بھری ہوئی ہے"۔

"اور تم سارا سال کروڑوں روپوں کے سونے کی اکیلے حفاظت کرتے رہے ہو اور تمہارے نزدیک یہ بہت بڑا کارنامہ ہے"۔ دائیں طرف سے ایک تالے نے لقمہ دیا اور اس کی بات بھی پوری نہ ہونے دی۔

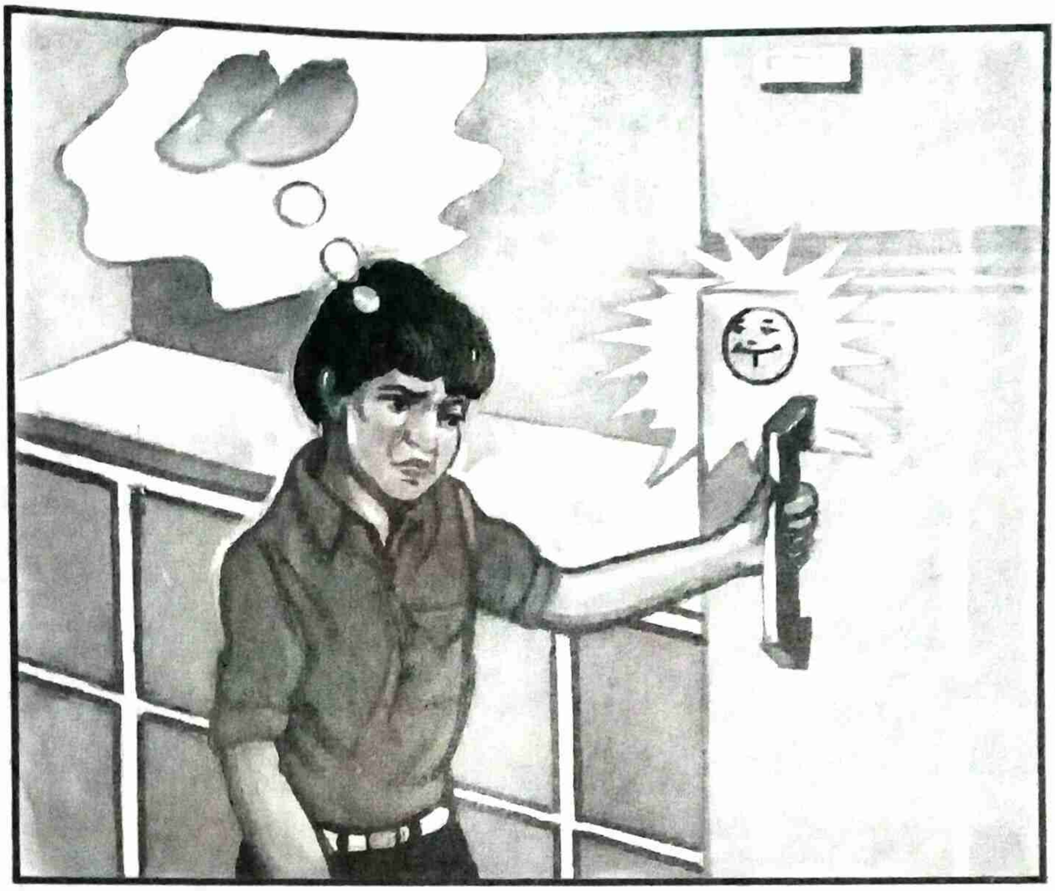

"ہاں کروڑوں روپے کے سونے کی حفاظت کرنا بہت بڑا کارنامہ ہے"۔ اس کی بات سن کر دوسرا تالا بولا۔

"تو پھر انعام تو تمہیں ملنا چاہیے"۔

"بالکل انعام مجھے ملنا چاہیے۔ میں انعام کا حق دار ہوں"۔

"تمہارے جیسے دنیا بھر کی جیولری مارکیٹوں کے بے شمار تالے بھی یہی کارنامہ سارا سال انجام دیتے رہے ہیں' ان کے بارے میں کیا خیال ہے؟" اس سے پہلے کہ تالا نمبر پانچ کوئی جواب دیتا کمپیئر تالے نے اعلان کیا:

"جناب! تو اب تشریف لاتے ہیں تالا نمبر چھ...... براہ مہربانی سب تالے نظم و ضبط کا مظاہرہ کریں"۔ کمپیئر کے اعلان کرتے ہی بائیں طرف سے ایک کالی رنگت والا موٹا سا تالا اسٹیج کی طرف بڑھا۔ تالا نمبر چھ نے اسٹیج پر آکر ایک نظر حاضرین تالوں پر ڈالی اور پھر گرج دار آواز میں بولا:

"میں جیل کا تالا ہوں"۔

"تو جیل میں جاؤ یہاں کیا کر رہے ہو؟"۔ ایک شریر تالے نے فقرہ کسا۔ تالہ نمبر سات نے اس جملے کا کوئی جواب نہ دیا اور اپنی بات جاری رکھی:

"میں نے سارا سال معاشرے کے ان لوگوں کو اپنی قید میں رکھا ہے جو لوگوں کو تنگ کرتے ہیں' قتل و غارت کرتے ہیں' لوٹ مار کرتے ہیں۔ میرا کام سب سے مختلف ہے۔ وہ بڑے بڑے مجرم جن کو میں نے اپنی قید میں رکھا ہے اگر جیل سے باہر آجائیں تو لوگوں کا جینا دوبھر ہو جائے۔ آپ خود سوچیں کیا میں انعام کا حق دار نہیں ہوں؟ بس مجھے کچھ اور نہیں کہنا"۔

"تمہیں نہیں کہنا تو ہمیں تو کہنا ہے۔ تالا نمبر چھ کی بات ختم ہوئی تو بے شمار جیل کے تالے اٹھ کھڑے ہوئے۔ سبھی انعام کے دعویدار تھے۔ شام تک اسی طرح اسٹیج پر تالوں کا آنا جانا لگا رہا۔ جب سب تالے باری باری اپنی بات کہہ چکے تو سردار تالے نے ایک خط جیوری کی طرف بڑھایا۔ خط پڑھنے کے بعد تینوں نے پہلے سردار تالے اور پھر ایک دوسرے کو معنی خیز انداز میں گھورا۔ انہوں نے تھوڑی دیر باہمی مشورہ کیا اور ایک کاغذ پر انعامی تالے کا نام لکھ دیا۔ سردار تالے نے فیصلے پر ایک نظر ڈالتے ہوئے تالوں کو مخاطب کیا۔

"جیوری نے اپنے فیصلے سے مجھے آگاہ کر دیا ہے۔ فیصلہ میرے سامنے ہے۔ جیوری نے جس تالے کو انعام کا حق دار قرار دیا ہے وہ یہاں موجود ہی نہیں ہے"۔

"اگر وہ تالا موجود نہیں ہے تو اسے انعام کیوں دیا گیا ہے؟" بہت سے تالوں نے یک زبان ہو کر پوچھا۔

"اس کا جواب میں دوں گا"۔ یہ کہہ کر سردار تالا اٹھ کھڑا ہوا۔ یہ سن کر سب تالوں کے منہ پر گویا چپ کا تالا لگ گیا۔

"اس کا تعلق پاکستان سے ہے۔ اس نے جو خط میرے نام لکھا ہے وہ تھوڑی دیر پہلے ہی مجھے ملا ہے۔ وہ خط آپ بھی

سن لیں:

جناب سردار تالا صاحب!

آداب!

آپ کا دعوت نامہ ملا ہے۔ دعوت نامہ بھیجنے کا بے حد شکریہ۔ میں ایک غریب فیکٹری مزدور کی سائیکل کا تالا ہوں۔ میں بھلا کیا کارنامہ انجام دے سکتا ہوں۔ میں تو اپنا فرض ادا کرنے کی کوشش کرتا ہوں۔ میں تقریب میں آگیا تو سائیکل کی حفاظت کون کرے گا۔ میں تقریب میں شرکت نہ کر سکوں گا۔ اس کے لیے معذرت خواہ ہوں۔

(والسلام ایک تالا)

یہ خط سن کر سب تالے یک زبان ہو کر بولے:

"جیوری کا فیصلہ درست ہے"۔

سردار تالے نے تقریب کے اختتام پر سب تالوں کو آگاہ کیا کہ آئندہ سال یہ تقریب نہیں ہو گی۔ سب تالے اپنے کارنامے لکھ کر بھیجا کریں گے۔ اس فیصلے سے سب تالے یہ بھی جان گئے کہ تالوں کا اصل کام تو حفاظت کرنا ہے۔

☆☆☆

جب کہانی ختم ہوئی تو اکرم بولا۔

"واقعی یار بہت مختلف کہانی ہے"۔

"تم بھی ایک تالے ہو اور میں بھی ایک تالا ہوں"۔ واجد نے کہا۔

"ہم تو انسان ہیں بھائی' تالے نہیں"۔ اکرم فوراً بولا۔

"میں گودام نمبر ایک اور تم گودام نمبر دو کے تالے ہو۔ ہم یہاں چوکیدار ہیں۔ یہاں کی چیزوں کی حفاظت کرنا ہمارا فرض ہے۔ میرے دوست اپنے گودام کو غیر محفوظ مت کرو۔ دوسروں کے ساتھ مل کر گودام میں بے ایمانی مت کرو۔ گودام کا مضبوط تالا بنو"۔ واجد کی باتوں سے اکرم اب جان چکا تھا کہ اس نے کہانی "انعامی تالا" اسے پڑھنے کے لیے کیوں دی ہے۔ اس نے پہلے کبھی اس بارے میں سوچا ہی نہیں تھا۔ اس نے ایک نظر کہانی پر ڈالی اور پھر اگلے ہی لمحے واجد کو گلے لگاتے ہوئے بولا: "میں گودام کا مضبوط تالا بنوں گا۔ میں گودام کو غیر محفوظ نہیں کروں گا"۔ یہ کہتے ہوئے اس کی نظر دیوار پر لگے ہوئے ایک کیلنڈر پر پڑی جس پر لکھا ہوا تھا کہ حضور ﷺ کا ارشاد پاک ہے کہ اللہ کے نزدیک بہترین دوست وہ ہے جو اپنے دوست کا خیر خواہ ہو"۔ یہ حدیث مبارکہ پڑھ کر اکرم کو محسوس ہوا کہ جیسے واجد نے واقعی حق دوستی ادا کر دیا ہو۔ ☆

تالوں کا جادوگر

ہیری ہوڈینی کو تالوں کا جادوگر کہا جاتا ہے۔ وہ ہنگری میں پیدا ہوا۔ چھ سال ہی کی عمر میں اس نے جادوگری کے کرتب دکھانے شروع کر دیئے تھے۔ بڑا ہوا تو ایک سرکس میں ملازم ہو گیا جہاں اس نے بازی گروں کو طرح طرح کے نئے اور حیران کن کرتب سکھائے۔ اسی دوران اس نے ایک عجیب طرح کا کرتب دکھانا شروع کیا۔ سرکس کے تماشائی اسے رسیوں سے خوب اچھی طرح جکڑ دیتے تھے۔ اس کے بعد دیکھتے ہی دیکھتے وہ حیرت انگیز طور پر خود کو آزاد کر لیتا تھا۔

12 سال کی عمر میں اس نے تالے بنانے والے ایک ماہر کے پاس نوکری کر لی اور پھر یہیں سے اس نے تالوں کو آسانی سے کھولنے کا فن سیکھا۔ اس فن میں اتنی مہارت حاصل کی کہ ایک دفعہ گھر میں تالے میں بند ماں کے بنائے ہوئے کیک اور پیسٹریاں سب اڑا لیں اور پھر تالا ویسے ہی دوبارہ لگا دیا۔ اسی مہارت کے بل بوتے پر وہ "تالوں کا جادوگر" مشہور ہو گیا۔ زندگی میں اس نے کئی مشکل ترین جگہوں سے رہائی حاصل کی جن میں بنکوں کے مضبوط سیف اور فولادی صندوق وغیرہ شامل ہیں۔ عجیب بات یہ ہے کہ ایک دفعہ اُسے ہاتھ پاؤں باندھ کر اور ایک صندوق میں بند کر کے چھ فٹ گہری زمین میں دفن کر دیا گیا جہاں سے وہ زندہ سلامت باہر نکل آیا۔ اس کا ایک کرتب کچھ اور بھی حیران کن ہے۔ ایک ٹینک میں پانی بھر دیا گیا اور پھر سر کے بل کھڑا کر کے اُسے زنجیروں اور تالوں میں جکڑ دیا گیا۔ لیکن کچھ ہی دیر بعد وہ ہانپتا اور لمبے لمبے سانس لیتا ہوا باہر نمودار ہو گیا...... حیران کن کرتب دکھانے والا تالوں کا یہ جادوگر 52 سال کی عمر میں اس دنیا سے رخصت ہوا۔

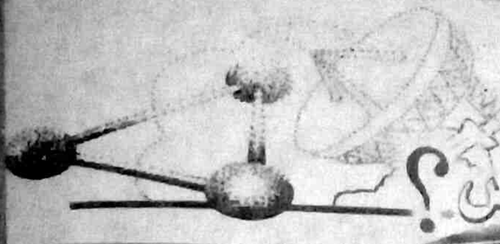

کیا آپ جانتے ہیں؟

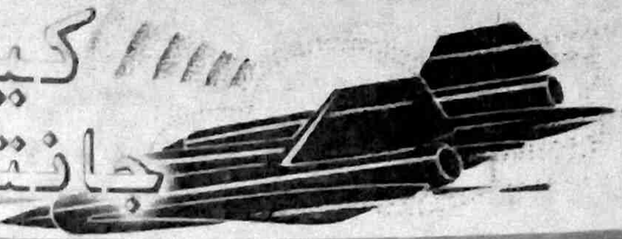

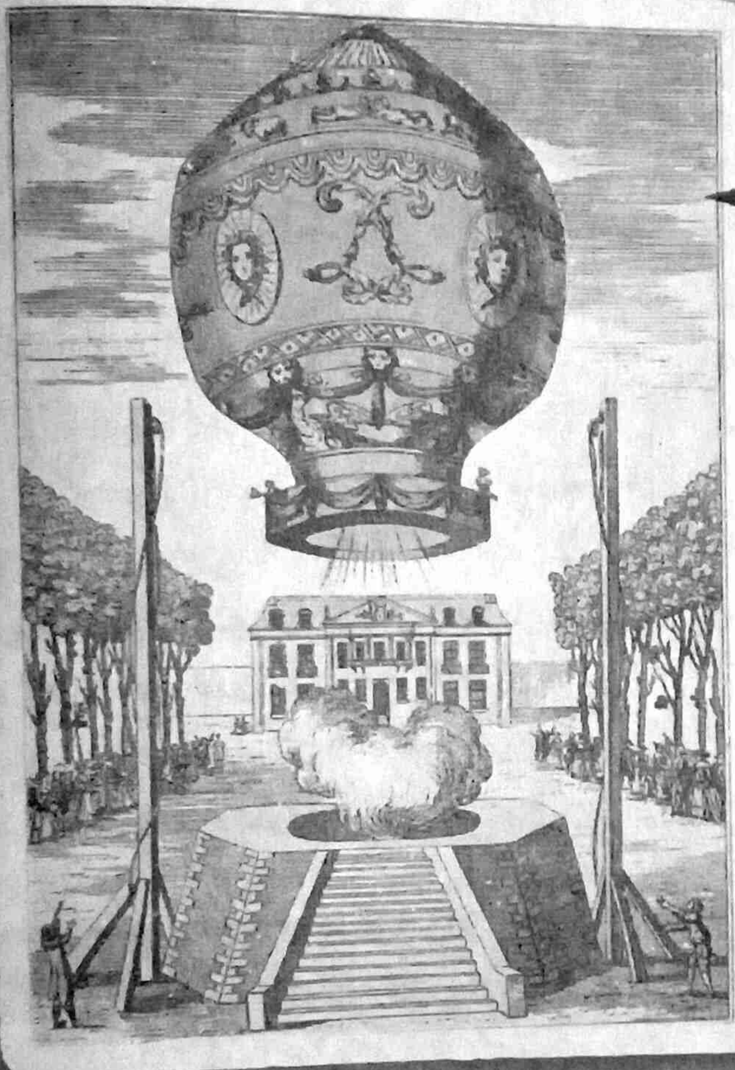

پرواز نمبر ایک

انسان نے پہلا فضائی سفر ایک گرم ہوائی غبارے میں کیا۔ یہ گیسی غبارہ 1783ء میں دو فرانسیسی بھائیوں مونٹ گولفئر نے تیار کیا اور فرانسیسی دارالحکومت پیرس کے اوپر پرواز کی۔ چونکہ اس وقت تصاویر کا رواج نہیں تھا۔ یہ تصویر اس دور کے ایک مشہور مصور نے اپنی یادداشت کی بنیاد پر بنائی تھی۔

پہلا ٹیلی ویژن سیٹ

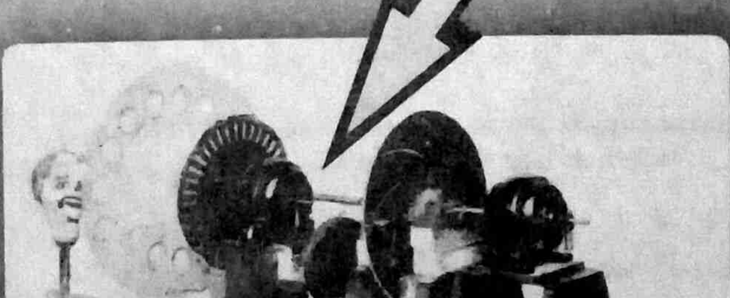

پہلا ابتدائی عملی ٹیلی ویژن سسٹم 1926ء میں سکاٹ لینڈ کے باشندے John Logie Baird نے ایجاد کیا تھا۔ اس سسٹم میں ٹیلی ویژن کیمرے سے تصویر لے کر اُسے ریڈیو سگنل میں تبدیل کیا جاتا تھا۔ پھر ان کو ٹرانسمیٹر کے ذریعے بھیجا جاتا تھا۔ یہ سگنل گھروں میں موجود ٹیلی ویژن سیٹ پر انٹینا اور ایریل کے ذریعے تصویروں میں منتقل ہو جاتے تھے۔

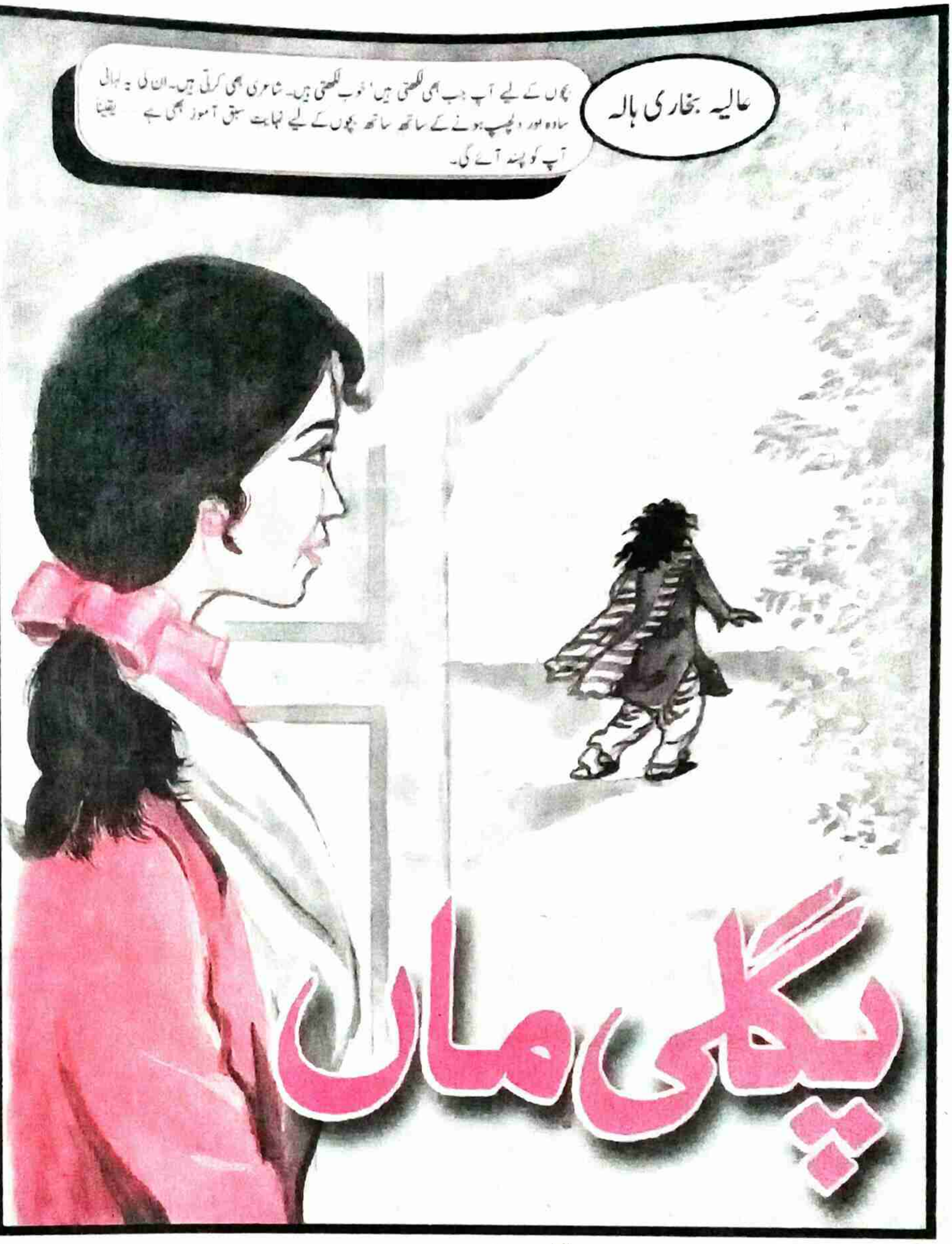

پگلی ماں

عالیہ بخاری ہالہ

بچوں کے لیے آپ جب بھی لکھتی ہیں' خوب لکھتی ہیں۔ شاعری بھی کرتی ہیں۔ ان کی یہ کہانی سادہ اور دلچسپ ہونے کے ساتھ ساتھ بچوں کے لیے نہایت سبق آموز بھی ہے۔ یقیناً آپ کو پسند آئے گی۔

کنیز...... اری او کنیز...... پگلی ماں کی آواز ہوا کے دوش پر لہراتی میرے کانوں میں اترتی چلی گئی۔ میں نے گیٹ کھول کر باہر جھانکا۔ سامنے موڑ پر پگلی ماں کھڑی کسی انجانی' ان دیکھی کنیز کو بلا رہی تھی۔ سب اسے پگلی ماں ہی کہتے تھے۔ جانے وہ کب سے ہمارے محلے میں تھی! پھٹے پرانے کپڑوں اور بکھرے بالوں کے ساتھ وہ گلی گلی کنیز او کنیز پکارتی دیوانہ وار پھرتی رہتی تھی۔ جہاں تھکتی بیٹھ جاتی' نیند سے بے حال ہوتی تو جہاں مرضی گر کر سو جاتی کوئی کھانا دے دیتا تو کھا لیتی ورنہ ہر وقت کنیز کی لگن میں یونہی پھرتی رہتی۔ میں جب بھی اسے دیکھتی میرا دل چاہتا کہ میں کسی سے اس کے بارے میں پوچھوں۔ وہ کون ہے۔ لوگ اسے پگلی ماں کیوں کہتے ہیں؟ کنیز کون تھی۔ وہ کہاں گئی؟ اسے دیکھ کر بہت سے سوال میرے ذہن میں آتے۔ میں پکا ارادہ باندھتی کہ مما سے یا خالہ پڑوسن سے پگلی ماں کے بارے میں ضرور پوچھوں گی لیکن پھر مجھے خود بھی یاد نہ رہتا۔ گرمیوں کی اس تپتی دوپہر میں بیڈ روم کی طرف جاتے ہوئے میں نے سوچا آج میں مما سے پگلی ماں کے بارے میں ضرور پوچھوں گی۔ ارے میں نے آپ کو اپنے بارے میں تو بتایا ہی نہیں۔ میرا نام گل ہے۔ میں ساتویں جماعت میں پڑھتی ہوں۔ میرے بہن بھائی مما' بابا اور ٹیچرز سب مجھ سے خوش رہتے اور بے حد پیار کرتے ہیں۔

ہاں تو میں آپ کو پگلی ماں کے متعلق بتا رہی تھی۔ میں اندر آئی تو مما نے مجھے اپنے ساتھ لٹا لیا۔ وہ دوپہر میں سونے کی عادی ہیں۔ مجھے پتا تھا ابھی کچھ دیر میں گہری نیند سو جائیں گی۔ عموماً ہم بہن بھائی بھی کچھ دیر کو سو جاتے ہیں ورنہ چپکے چپکے کمرے میں ہی کھیلتے رہتے ہیں۔

"مما یہ پگلی ماں کون ہے؟" میں نے پوچھا۔

"پگلی ماں...... " مما کچھ سوچتے ہوئے بولیں۔ "پاگل ہی ہے ناں بیچاری...... " بھیا نے میرا مذاق اڑایا۔ "نہیں بیٹا!...... " مما نے ٹوکا: "کوئی بھی...... بس ایسے ہی تو پاگل نہیں ہو جاتا ناں۔ کچھ بچے ضرور پیدائشی ہوتے ہیں۔ لیکن کچھ لوگوں کو حالات اس مقام پر لے آتے ہیں۔ جانتے ہو جب میں بیاہ کر آئی تھی تو محلے میں سب

سے پہلے شائستہ نئی دلہن کو دیکھنے آئی تھی۔ مما نے دور کہیں ماضی میں کھو کر کہا۔ "ہاں...... پگلی ماں کا نام شائستہ ہی ہے۔ شائستہ کا شوہر ایک روڈ ایکسی ڈنٹ کا شکار ہو گیا تھا۔ اس وقت ان کی بیٹی کنیز ایک سال کی تھی۔ میاں کے مرنے کے بعد پھر اپنے ماں باپ کے پاس رہنے لگی۔ اس کا ایک بھائی بھی تھا جو کسی دوسرے ملک جا بسا تھا۔ وہاں سے وہ اپنے ماں باپ کو ہر ماہ کچھ خرچہ بھیج دیتا تھا۔ شائستہ سلائی کڑھائی کی ماہر تھی۔ وہ بھی اچھا کما لیتی تھی۔ ماں باپ چاہتے تھے کہ بیٹی کو دوبارہ کوئی بھلا آدمی دیکھ کر بیاہ دیں۔ لیکن شائستہ کو اپنی بیٹی سے بہت پیار تھا اور وہ اپنے ماں باپ کو بھی بے سہارا چھوڑنا نہیں چاہتی تھی۔ اس کی بیٹی سات برس کی ہو چکی تھی۔ بہت پیاری اور ذہین بچی تھی۔ شائستہ اسے ہر وقت گڑیا کی طرح سجاتی رہتی۔ اس کی بچی پڑھنے میں بھی ہوشیار تھی۔ مجھے یاد ہے گلی میں آتے جاتے اکثر وہ کھیلتی نظر آتی۔ کبھی کبھی اس کی ماں دروازے پر آتی اور زور سے آواز دیتی۔ کنیز...... اری او کنیز' اور کنیز بھاگتی ہوئی اپنی ماں کے پاس چلی آتی۔ اس روز شائستہ کے ماں باپ کہیں گئے ہوئے تھے۔ سلائی کرتے کرتے وہ تھک گئی تو دوپہر کو ذرا آرام کرنے لیٹ گئی۔ کنیز اس کے پاس بیٹھی کچھ پڑھ رہی تھی۔ "ماں!......" اچانک کنیز نے کہا۔ "میں اپنی دوست کے گھر سے کتاب لے آؤں"۔

"شام کو جانا"۔ شائستہ نے غنودگی میں کہا۔ کچھ دیر میں اس کی آنکھ لگ گئی۔ وہ جاگی تو کنیز گھر پر نہیں تھی۔ شاید گلی میں کھیل رہی ہو۔ اس نے دروازے پر کھڑے ہو کر آواز دی۔ پھر موڑ پر جا کر پکارا۔ پھر وہ اس کی سہیلی کے گھر سے بھی ہو آئی۔ وہ لوگ تو شادی پر گئے ہوئے تھے۔ گھر پر صرف نوکر تھا۔ اس وقت وہ بھی موجود نہیں تھا۔ یہ بات بھی شائستہ کو ان کے پڑوسیوں نے بتائی تھی۔ جون کی اس گرم دوپہر میں گلیاں تقریباً ویران تھیں۔ اس کی بچی کو کسی نے بھی نہیں دیکھا تھا۔ شائستہ پاگلوں کی طرح اپنی بچی کو ڈھونڈ رہی تھی۔ لیکن بچی نہ ملی دوسرے تیسرے دن آبادی سے ذرا باہر ایک زیر تعمیر عمارت میں بچی کی لاش ملی۔ پولیس نے تفتیش کی تو پتا چلا کہ بچی نے کھیلتے ہوئے ماں کی سونے کی چین اٹھا کر پہن لی تھی۔ اس کے کانوں میں چھوٹی چھوٹی بالیاں بھی تھیں۔ سہیلی کے گھر جو نوکر تھا وہ اس زیور کے لیے بچی کو بہلا پھسلا کر ویرانے میں لے گیا۔ پھر بچی کے مزاحمت کرنے پر گلا دبا کر پھول سی بچی کو مار ڈالا۔ شائستہ نے بچی کی لاش دیکھی لیکن ذہنی توازن کھو جانے کی وجہ سے اسے اپنی بچی ماننے سے انکار کر دیا۔ وہ آج بھی گلیوں گلیوں اپنی کنیز کو ڈھونڈتی پھرتی ہے۔

"ہائے اس نے بچی کو مار ہی ڈالا"۔ مہک نے نم آنکھوں سے کہا۔ "ہائے وہ باہر نہ جاتی"۔

"ہاں بیٹی۔ کچھ لوگ تھوڑے سے فائدے کے لیے بڑے بڑے گناہ کر بیٹھتے ہیں۔ شیطان انہیں اس طرح بھٹکا دیتا ہے کہ وہ نیک و بد کی تمیز بھول جاتے ہیں۔ مما نے کروٹ بدل کر آنکھیں موند لیں۔ "وہ بچی کو جان سے تو نہ مارتا بیچاری پگلی ماں!" گوہر رنجیدگی سے بولا۔

"اس نے سوچا ہوگا کہ بچی سب کو بتا دے گی کہ چین اور بالیاں اس نے لی ہیں۔ اس لیے اس کو مار ہی دو"۔ بھیا نے کسی فلاسفر کی طرح چھت کو گھورتے ہوئے کہا۔

دروازہ کھٹکا تھا۔ میں نے کھولا تو ڈاکیا آج کی ڈاک لیے کھڑا تھا۔ سامنے گلی میں خالدہ حرا اور رابعہ کھیل رہی تھیں۔ "گل آؤ لکن میٹی کھیلیں۔" مجھے دیکھ کر رابعہ چلائی۔ "آجاؤ ناں۔ تم تو کبھی آتی ہی نہیں ہو"۔ خالدہ نے کہا۔

اصل میں ہم بہن بھائیوں کو گلی میں جا کر کھیلنے کی اجازت ہی نہیں تھی۔ اتنا بڑا لان تھا۔ وہیں شام کو سب سہیلیاں آجاتیں۔ لیکن اس وقت تو ماما سو رہی تھیں۔ میرا جی چاہا کہ میں کچھ دیر کو ان کے ساتھ جا کر کھیل ہی لوں۔ پگلی ماں وہیں ایک مکان کے سائے میں سکڑی سمٹی سو رہی تھی۔ اچانک وہ اٹھی اور آہستہ آہستہ چلتی گلی کے موڑ پر جا کھڑی ہوئی۔ ادھر ادھر متلاشی نظروں سے دیکھنے کے بعد وہ چلائی کنیز...... اری او کنیز!

یکایک مجھے ایسا لگا جیسے پگلی ماں میری مما ہوں جو اس ویران دوپہر میں اپنی کھوئی ہوئی بیٹی کو ڈھونڈ رہی ہوں۔ میں نے لرز کر دروازہ بند کر دیا۔ اندر آ کر میں نے دیکھا سب سو رہے تھے۔ مما کے پیروں سے لپٹ کر لیٹتے ہوئے میں نے چپکے سے اپنی جنت کو پیار کر لیا اور پھر سونے کے لیے آنکھیں موند لیں۔ ☆☆☆

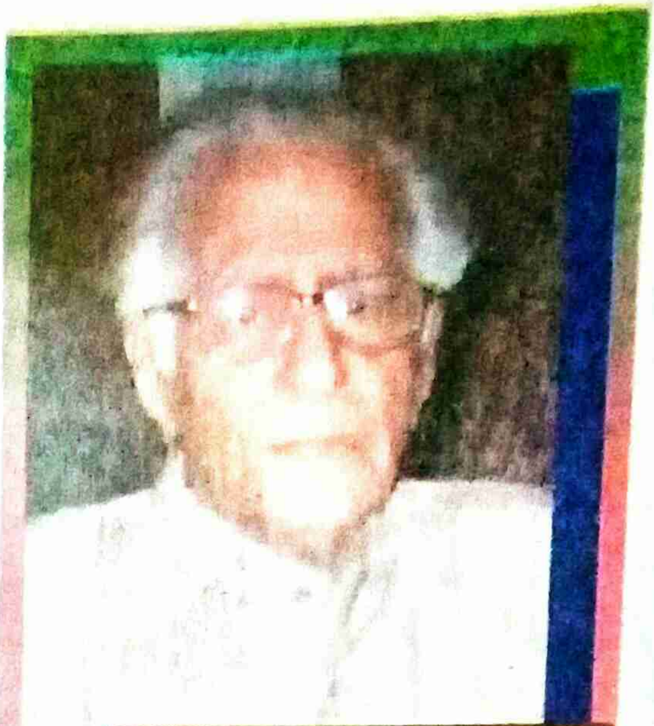

جناب احمد ندیم قاسمی کہتے ہیں:

بچپن مجھے عزیز ہے!

افلاس و تموّل (یعنی غربت اور خوشحالی) کا ایک درد ناک مرکب ہونے کے باوجود مجھے میرا بچپن عزیز ہے۔ کبھی کبھی سوچنے لگتا ہوں کہ اگر میرا بچپن مسلسل امارت میں گزرتا تو میں وہ شدتِ احساس کہاں سے لاتا، جو اچھے ادب کی تخلیق کا نہایت اہم عنصر ہے۔ پھر خیال آتا ہے کہ اگر مفلسی کے ماحول میں مجھے امارت کی جھلکیاں دکھائی نہ دیتیں تو تقابل کی وہ تڑپ کہاں سے آتی جس کے بغیر زندگی صرف روتے بسورتے یا صرف ہنستے گزر جاتی ہے۔

ساڑھے چار برس کی عمر میں اپنے گاؤں کی مسجد میں عربی پڑھنے بیٹھا تو میرے ہم سبق میرا نیا نیا اور اچھا اچھا لباس دیکھ کر میری عزت کرنے اور کچھ اسی وجہ سے دور رہنے لگے۔ جب میں نے ایک روز باجرے کی روٹی میں ملی ہوئی سرخ مرچوں کی گیند سی نکالی اور مزے سے کھانے لگا تو میرے ہم سبق حیران ہو کر میرے قریب کھسک آئے اور مجھے اپنا سمجھنے لگے۔

موٹا سا تھن متھنا بچہ دیکھ کر مولوی جی نے پہلے ہی روز اعلان کر دیا کہ یہ لڑکا غبی (یعنی کند ذہن) ثابت ہو گا۔ "موٹے لڑکے ذہین نہیں ہوتے، میرا ساٹھ برس کا تجربہ ہے"۔ لیکن یہاں تو امی کی طرف سے ہدایت ملی تھی کہ اچھا نہ پڑھو گے تو ہر روز بعد از دوپہر بھنے ہوئے چنوں اور گڑ کا "راشن" بند کر دیا جائے گا ...... اور "بیٹا! جو بچے نالائق ثابت ہوتے ہیں انہیں مرنے کے بعد دوزخ میں جلایا جاتا ہے"۔ ایسے حالات میں جی لگا کر نہ پڑھنا زندگی اور آخرت دونوں سے دشمنی تھی۔

پانچ برس کی عمر میں پرائمری اسکول میں داخل ہوا اور پہلی جماعت کے ادنیٰ و اعلیٰ درجوں سے جو "مانیٹری" شروع کی ہے تو دسویں جماعت تک یہ "ٹر" میرے ساتھ رہی۔ اس کے بعد آب کاری کا سب انسپکٹر بنا، پھر اڈیٹر بنا۔ زندگی کی وہ آسائشیں اور "عیاشیاں" جو بچپن سے منسوب کی جاتی ہیں اور انسانی جسم کے نشوونما اور انسانی ذہن کے ارتقا کے لیے اہم سمجھی جاتی ہیں، میری دسترس سے دور رہی ہیں۔

مجھے یاد ہے کہ ایک دفعہ بہت دیر تک رونے کے بعد جب مجھے ریوڑیاں خریدنے کے لیے ایک پیسہ ملا تھا اور میں آنسوؤں کو ملے بغیر اسی حالت میں ریوڑیاں چبا رہا تھا تو اچانک مجھے ایک شرارت سوجھی۔ ریوڑیوں سے تل اتار کر ایک ننھی سی کنکری اٹھائی، اس پر ریوڑی کی شیرینی کو محنت سے رگڑا اور پھر اس پر تل چپکا کر یہ "ریوڑی" میں نے ایک دوست کو پیش کر دی۔ اس سنگین ریوڑی کو چباتے ہی وہ چلا چلا کر رویا ہے تو آن کی آن میں سارا محلہ میری شرارت کی نوعیت معلوم کر کے قہقہوں سے چھلک اٹھا۔

اب تو زندگی بہت آگے نکل آئی ہے، بچپن دھندلا چکا ہے۔ نظریات بدل چکے ہیں۔ ماحول تبدیل ہو چکا ہے۔ بچپن کے کئی ساتھی ہمیشہ کے لیے جدا ہو چکے ہیں۔ سات برس کا تھا تو ابا جو آخر عمر میں مجذوب سے ہو گئے تھے، چل بسے۔ بھائی جان کے بارے میں اتنا یاد ہے کہ ان کا تھپڑ میرے سامنے نیلے نیلے ستاروں کا ایک فوارہ چھوڑ دیتا تھا اور ان کی تھپکی مجھے ان سے لپٹ لپٹ کر رونے پر مجبور کر دیتی تھی۔ میری امی تو خیر میرے احساسات کی تشکیل کی سب سے بڑی معاون ہیں۔ انہوں نے مجھے خودداری، صداقت، غیرت مندی اور اولوالعزمی کے نہایت خاموش مگر بے حد موثر سبق دیئے اور اب میں اپنے بچپن کا تصور کرتا ہوں تو یوں محسوس ہوتا ہے جیسے مجھ پر میری امی نے اپنے بازوؤں سے چھاؤں کر رکھی ہے۔

☆☆☆

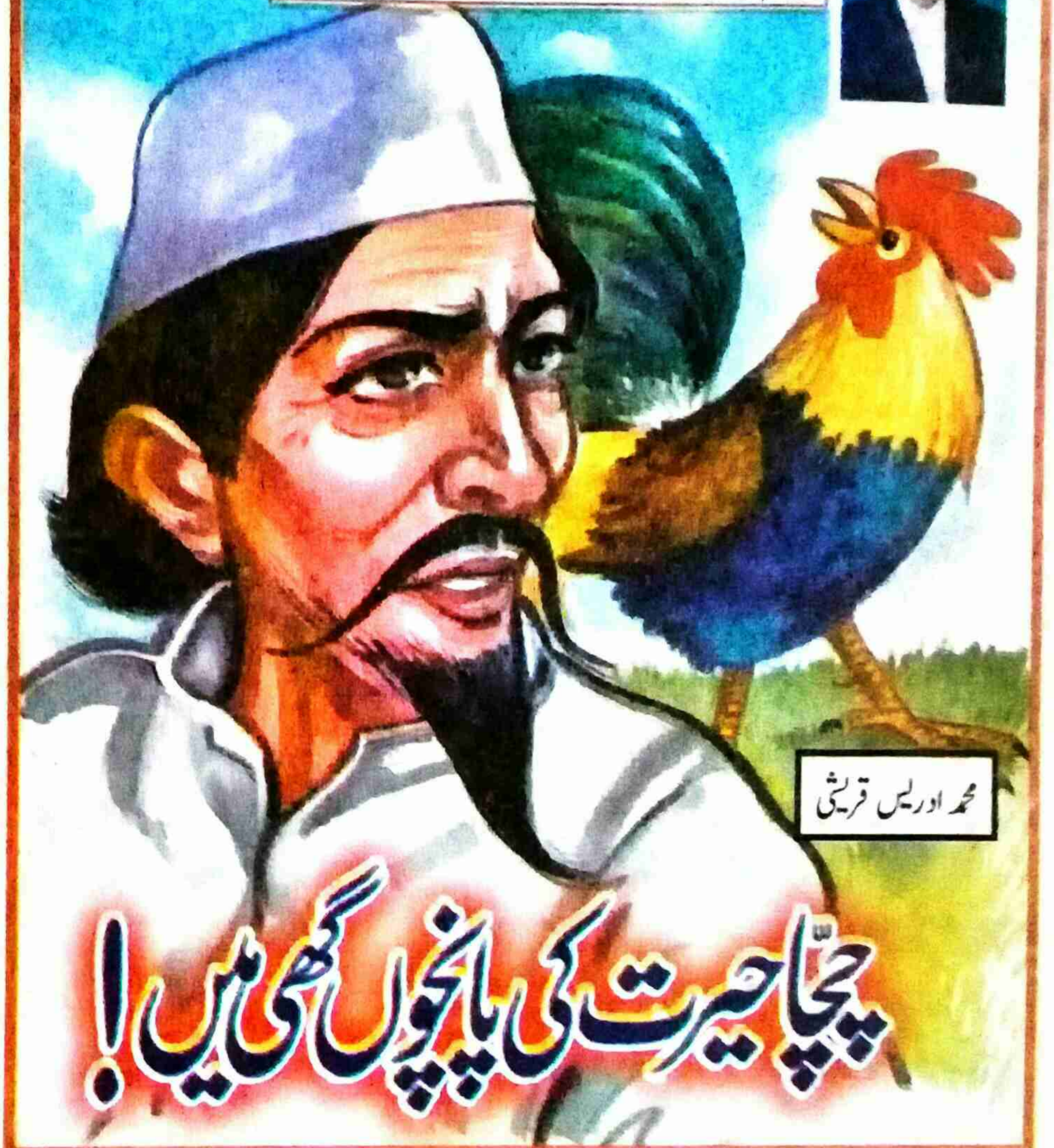

چچا حیرت کی پانچوں گھی میں!

محمد ادریس قریشی

بچوں کے ادب کے حوالے سے آپ کا نام محتاج تعارف نہیں۔ "چچا حیرت کی مزے مزے کی ہنسا ہنسا کر لوٹ پوٹ کر دینے والی کہانیاں" تعلیم وتربیت کے لیے خاص طور پر لکھ رہے ہیں۔ یہ کہانیاں بچوں میں بے حد مقبول ہیں۔

چچا حیرت کے ہاتھ میں ایک لمبی سی لسٹ تھی۔ ان کی نظریں اس پر جمی ہوئی تھیں اور وہ لڑکھڑاتے قدموں سے سڑک پر چلے جا رہے تھے۔ اسی وقت ایک بھاری ہاتھ ان کے کندھے پر پڑا۔ "حیرت یار دیکھ کر چلو' کسی رکشے سے ٹکراؤ گے کیا؟"

چچا حیرت نے سر اٹھایا تو عیدا اور شیدا کھڑے آنکھیں گھما رہے تھے۔ چچا نے غصے سے کہا "تم دونوں کسی رکشے سے کم ہو کیا؟ ہر جگہ شیطان کی طرح ٹپک پڑتے ہو"۔

"لے لو! ایک تو مفید مشورہ دیا ہے ہم نے اوپر سے ہمیں برا کہہ رہے ہو"۔ عیدا بولا۔

"میرا خیال ہے کہ تم خریداری کرنے جا رہے ہو۔ آج کل تو پانچوں گھی میں ہیں تمہاری۔ منہ بولا بیٹا خیر سے اکاؤنٹ آفیسر ہے۔ زندگی مزے سے گزر رہی ہے"۔ شیدے نے چچا کے ہاتھ میں پکڑی لسٹ پر نظریں موڑتے ہوئے کہا۔

"تو تم کیوں جلے جا رہے ہو حیرت ہے' تم دونوں بھی تو آئے روز ہمارے ہاں دعوتیں اڑا رہے ہو"۔ چچا نے تیز آواز میں کہا۔

تینوں مرغ کے گوشت کی دکان پر آ پہنچے۔ وہاں پر کئی مرغے لٹکے ہوئے تھے۔ چچا نے کہا "قصائی بیٹے! ایک عدد دیسی مرغ دو کلو کا ذبح کر کے دو"۔

قصائی نے مرغوں کے جالی دار ڈربے میں ہاتھ ڈال کر ایک مرغ نکال لیا۔ چچا نے ناک منہ چڑھا کر کہا: "اے ہے' یہ تو کوئی خانہ بدوش مرغ لگتا ہے۔ کوئی خاندانی قسم کا مرغ ہمیں دو"۔

"آپ نے مرغ کا گوشت کھانا ہے یا اسے بھتیجا بنا کر رکھنا ہے"۔ قصائی نے آنکھیں نکالیں۔

"اے' ہمارے حیرت یار کا مذاق مت اُڑانا۔ ان کی پسند کا مرغ انہیں دو'۔ عیدے نے کہا۔

"تو پھر خود ہی اس میں سے نکال لیں" اس نے کہا۔

چچا حیرت نے ڈربے پر ایک نظر ڈالی اور کھڑکی کھول کر ایک تگڑے سے مرغ پر ہاتھ ڈال دیا۔ جب مرغ باہر نکلا تو چچا کے ہاتھ سے چھوٹ کر بھاگ نکلا۔ عیدا' شیدا اور چچا حیرت اس کے پیچھے لپکے مگر قصائی نے چچا حیرت کو پیچھے سے پکڑ لیا اور بولا "بڑے میاں' آپ ضمانت کے طور پر یہیں رہیں۔ ان دونوں کو مرغ کے پیچھے جانے دیں"۔

چچا حیرت کھڑے ہو کر انتظار کرنے لگے۔ تقریباً دس

منٹ بعد عیدا اور شیدا مرغ پکڑے آتے نظر آئے۔ ان کے ساتھ لوگوں کا ایک بڑا ہجوم بھی تھا۔ ہر شخص چیخ چیخ کر بول رہا تھا۔

"ارے ارے، حیرت ہے کمال ہے، کیا ہوا؟" چچا چلائے۔

عیدے اور شیدے کے سانس پھولے ہوئے تھے۔ ایک شخص عیدے کا بازو پکڑ کر چیخا "یہ شخص میرے ٹماٹروں کے ٹوکرے پر گرا اور سارے ٹماٹروں کا کچومر نکال دیا۔ پورے سو روپے کا ٹوکرا تھا میرا"۔

دوسرے شخص نے شیدے کا کالر پکڑ کر کہا "یہ موٹا میری ریڑھی سے ٹکرایا۔ میں چاول چھولے بیچتا ہوں۔ میرے پانچ پیالے ٹوٹ گئے۔ میں اس سے پچاس روپے لے کر رہوں گا"۔

تیسرے شخص نے کہا "یہ مرغا کم بخت میرے دہی کے کونڈے میں گرا اور تین کلو دہی کا ستیاناس کر دیا۔ میرا ساٹھ روپے کا نقصان پورا کرو"۔

ایک لمحے کو چچا حیرت کا سر چکرا گیا۔ پھر وہ حلق پھاڑ کر بولے "خاموش ہو جاؤ سب، اپنے نقصان کے پیسے لو اور چلتے بنو"۔

انہوں نے ان لوگوں کو پیسے دے کر عیدے اور شیدے کی جان چھڑائی۔ پھر انہوں نے مرغ پکڑ کر اُسے ایک چپت لگائی اور بولے "حرام خور! ڈیڑھ سو روپے کے تم خود ہو گے۔ نقصان دو سو دس روپے کا کر دیا"۔

"خاندانی مرغ ہے نا جی"۔ قصائی نے فقرہ کسا۔

پھر انہوں نے گوشت بنوا کر تھیلے میں ڈالا اور لسٹ کے مطابق دوسری چیزیں خریدنے لگے۔ سبزی کی دکان پر بہت رش تھا۔ انہوں نے وہاں سے کچھ چیزیں خریدیں پیسے دیئے اور تھیلا اٹھا کر گھر کی طرف چل پڑے۔

"یار حیرت! آج تو بہت بیستی (بے عزتی) خراب ہوئی"۔ عیدے نے کہا۔

کوئی بات نہیں۔ "بیستی" خراب ہو گئی ہے تو نئی ڈلوا لیں گے"۔ چچا نے لاپروائی سے کہا اور بولے: "لو بھئی! دوپہر کا کھانا ہماری طرف کھانا۔ ٹھیک ایک بجے تشریف لے آنا"۔

گھر آ کر چچا حیرت نے تھیلا شعیب کی بیوی کے حوالے کرتے ہوئے کہا۔ "روبی بیٹی جلدی سے کھانا بنا لو۔ میرے تو پیٹ میں چوہے دوڑ رہے ہیں"۔

"اوئی میں مر گئی" روبی چیخی۔

"کیا ہوا، کیا ہوا؟" چچی بھاگ کر باورچی خانے سے باہر آئیں۔

"آنٹی، انکل کے پیٹ میں چوہے گھس گئے ہیں۔ ہائے اب کیا ہو گا؟"

"ارے حیرت ہے میں نے تو محاورہ بولا تھا۔ تم یوں ہی ڈر گئیں"۔ چچا نے کہا اور اپنے کمرے میں گھس گئے۔ چند لمحوں بعد ان کے کمرے میں چچی داخل ہوئیں اور بولیں "یہ آپ آج کیا خرید کر لائے ہیں؟"

"کیا خرید کر لایا ہوں! جو لسٹ تم نے دی تھی، وہی تو چیزیں ہیں۔ مرغ ہے، ٹماٹر ہیں، دہی ہے، اورک ہے، وغیرہ وغیرہ ہے"۔ چچا نے ہونقوں کی طرح کہا۔

"یہ دیکھئے اس میں کوئی مرغ نہیں ہے۔ اس تھیلے میں تو کدو ہیں، ٹنڈے ہیں، توریاں ہیں اور چنے کی دال ہے"۔ چچی نے چیزیں باہر نکال نکال کر رکھنا شروع کر دیں۔

"ارے، یہ تو لگتا ہے میں سبزی کی دکان سے کسی اور کا تھیلا اٹھا لایا، حیرت ہے"۔ وہ بولے۔

چچی نے کہا "بالکل ٹھیک! یہ تھیلا ہمارے تھیلے جیسا ہے۔ اس لیے آپ دھوکا کھا گئے"۔

"دھوکا تو کھا گیا لیکن کدو کیسے کھاؤں گا۔ مجھے کدو اور ٹنڈے بالکل اچھے نہیں لگتے"۔ چچا نے منہ بنایا۔

"ہاں ہاں، جیسے آج تک آپ روز گوشت ہی کھاتے رہے ہیں۔ وہ تو خدا کا شکر ادا کریں کہ جمال بھائی"۔

"چپ چپ بیگم...... خبردار روبی کے سامنے ہماری بے عزتی خراب نہ کرنا۔ اب جو کچھ آ گیا ہے وہی پکا لو۔ دوبارہ بازار جا کر اپنا تھیلا ڈھونڈنے کی ہمت ہم میں نہیں۔ اللہ کرے جو شخص ہمارا مرغا لے گیا ہو اسے ہضم نہ ہو، الٹیاں کرتا پھرے"۔ چچا نے ہاتھ ہلا ہلا کر کہا۔

"بس کریں اب، قصور اپنا ہے اور بددعائیں دوسروں کو دے رہے ہیں"۔ چچی نے کہا اور سبزیاں اٹھا کر باورچی خانے میں

چلی گئیں۔

ٹھیک ایک بجے عیدا اور شیدا آپہنچے۔ عیدے نے زور سے کہا۔ لو یار حیرت، ہم تشریف سمیت آگئے ہیں؟"

چچا کا چہرہ مرجھایا ہوا تھا۔ وہ دونوں بیٹھک میں بیٹھ گئے۔ عیدے نے فضا میں خوشبو سونگھتے ہوئے کہا "واہ کیا بات ہے، چکن سے چکن کی خوشبو تو بڑی پیاری آ رہی ہے"۔

چچا حیرت دل ہی دل میں سٹپٹا رہے تھے۔ پھر انہوں نے کھانا اندر سے لا کر رکھا۔ عیدے اور شیدے نے ڈونگے کا ڈھکن اٹھایا تو زور سے اُچھل پڑے"۔ ارے! یہ کیا بدتمیزی ہے؟"

"کیوں، کیا ہوا حیرت ہے؟" چچا نے انجان بن کر کہا۔

"یہ تو کدو ہیں" دونوں ایک ساتھ بولے۔

"ارے نہیں ہیں۔ یہ مرغ ہی ہے۔ اصل میں ہمارے گھر میں رات سے آسیب آیا ہوا ہے۔ جس کی وجہ سے جب ہم مرغ پکاتے ہیں تو ہانڈی میں کدو بن جاتے ہیں"۔ چچا نے احمقانہ انداز میں کہا۔

"تو پھر بہتر ہے کہ کدو پکا لیا کرو تاکہ مرغ بن جائے"۔ شیدے نے غصے سے کہا۔

چچا نے انہیں ساری بات بتا دی اور کہا "سبزی کی دکان پر رش تھا۔ اس لیے میں غلطی سے اپنا تھیلا وہاں چھوڑ کر کسی سبزی خور کا تھلا اٹھا لایا۔ قصور تم دونوں کا بھی ہے۔ تم نے میری توجہ اس طرف کیوں نہ دلائی"۔

"ہمارا کوئی قصور نہیں ہے بلکہ ہمارا شیخوپورہ بھی نہیں ہے۔ چلو گزارہ کرتے ہیں۔ اس موقع پر کوئی شعر ہی ہو جائے"۔ عیدا بولا۔

چچا حیرت نے گلا صاف کیا اور بولے "دو شعر عرض کرتا ہوں"۔

"ارشاد"۔ عیدا اور شیدا ایک ساتھ بولے۔

چچا نے کہا:

یہ کیسا چکر ہمارے ساتھ آج چل گیا ہے
کسی کے تھیلے سے اپنا تھیلا بدل گیا ہے
ہمیں تو شب بھر یہ غم ستاتا رہے گا یارو
ہمارے ہاتھوں سے دیسی مرغا نکل گیا ہے

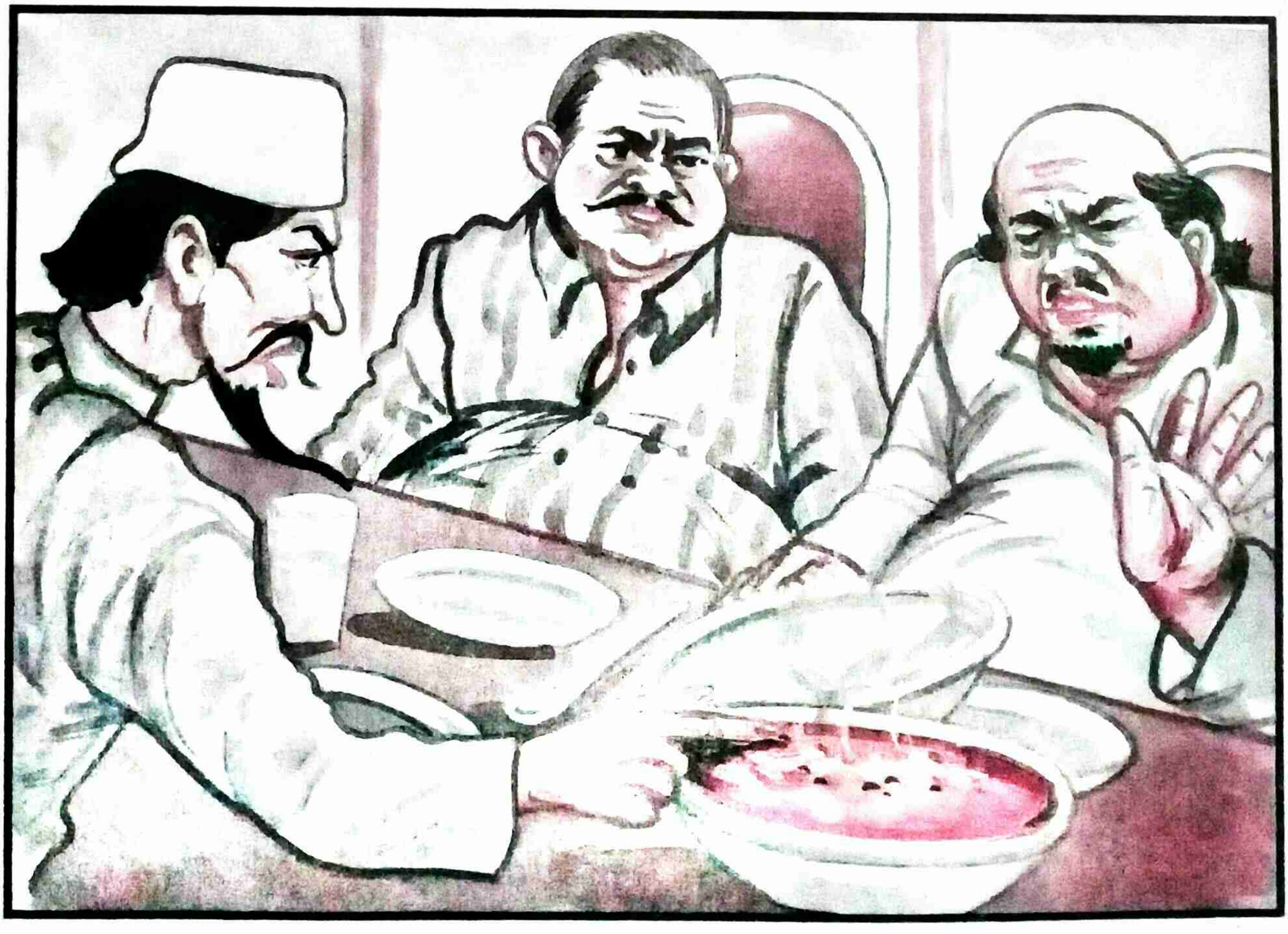

"واہ وا' واہ وا' اسی خوشی میں ہو جائے کدوؤں کا صفایا"۔ شیدے نے کہا اور وہ تینوں کھانا کھانے لگے۔

شعیب جمال شام کو دفتر سے واپس آتا تھا۔ رات کے کھانے میں وہ ریسٹورنٹ سے بہت سی چیزیں لے آیا۔ اسی طرح دن گزرتے رہے۔ چچا حیرت اور چچی کی طبیعت خراب رہنے لگی تھی۔ ایک دن چچا اور چچی ایک ڈاکٹر کے پاس گئے جس نے ان کے ٹسٹ کیے اور بتایا کہ چچا کی شوگر کم ہو گئی ہے اور چچی کا جگر متاثر ہے۔

چچا محلے میں ہر کسی کو بتاتے پھر رہے تھے "ارے بھئی' ہمیں کوئی بیماری نہیں ہے۔ صرف تھوڑا سا میٹھا کم ہو گیا ہے"۔

ان کا منہ بولا بیٹا شعیب رات کو عموماً بیٹھک میں بیٹھتا تھا اور اس سے ملنے کے لیے بہت سے لوگ آتے رہتے تھے۔ ایک رات چچا حیرت ڈنر کے بعد گلی میں ٹہل رہے تھے کہ دو آدمی آئے۔ ایک نے کہا "بزرگو! کیا اندر شعیب صاحب بیٹھے ہیں؟"

چچا نے ہاتھ ہلایا "ابھی تھوڑی دیر پہلے تو کھڑا تھا' اب شاید بیٹھ گیا ہو"۔

وہ دونوں ہنسنے لگے۔ چچا انہیں بیٹھک میں لے آئے اور خود بھی بیٹھ گئے۔ ایک آدمی نے کہا۔ "شعیب صاحب بل کا کیا بنا؟"

"آپ سے میں نے کہا تھا کہ آپ کچھ ہمت کریں بل تو پاس ہو جائے گا"۔ شعیب بولا۔

"ٹھیک ہے' یہ لیں تین ہزار روپے"۔

شعیب نے تین نوٹ گنے اور بولا "ماجد صاحب' آپ کا پچاس ہزار کا بل ہے۔ دس پرسنٹ سے بھی پانچ ہزار بنتے ہیں۔ آپ ایک ہزار اور دے دیں"۔

"اچھا اچھا' چلو کوئی بات نہیں" اس شخص نے ایک نوٹ اور شعیب کی طرف بڑھا دیا۔

کچھ دیر بعد وہ چلے گئے۔ چچا گم صم بیٹھے تھے۔ شعیب نے کہا "انکل! کیا بات ہے۔ چپ چپ بیٹھے ہیں۔ طبیعت تو ٹھیک ہے نا؟"

چچا حیرت نے کھوئی کھوئی آواز میں کہا "بیٹا' ایک وقت تھا کہ ہم روکھی سوکھی کھاتے تھے لیکن طبیعت ٹھیک رہتی تھی۔ زیادہ بھی ہوا تو معمولی سر درد یا بخار ہو گیا۔ وہ بھی اسی دن ٹھیک ہو جاتا تھا۔ اب جب سے ہماری پانچوں گھی میں ہیں' ہمیں نئی نئی بیماریاں لگتی جا رہی ہیں۔ اس کی وجہ مجھے اب سمجھ میں آگئی ہے"۔

"اچھا' کیا وجہ ہے انکل؟" شعیب نے بڑے پیار سے کہا۔

"تم جانتے ہو کہ پچھلے ایک مہینے میں میری اور بیگم کی دواؤں اور ٹسٹوں پر کئی ہزار روپے لگ چکے ہیں۔ روبی بیٹی کو بھی ہفتے میں ایک بار ڈاکٹر کے پاس جانا پڑتا ہے۔ خود تم رات کو نیند کی گولیاں کھا کر سوتے ہو۔ وجہ یہ ہے کہ تم ہمیں حرام کھلا رہے ہو۔ حرام کا مال حرام راستے پر ہی جاتا ہے نا بیٹا اور بے سکونی الگ ہوتی ہے۔ حالانکہ تمہاری تنخواہ بھی معقول ہے۔ پھر تم نے یہ کام کیوں شروع کر دیا ہے"۔ چچا حیرت کی آواز بھرا گئی۔

شعیب جمال کا سر جھک گیا۔ چچا حیرت نے پھر کہا "اگر تم نے یہی کام کرنا ہے تو تم اپنی بیوی کو لے کر یہاں سے چلے جاؤ۔ ہمیں تمہارے سہارے کی کوئی ضرورت نہیں ہے"۔

شعیب نے سر اوپر اٹھایا تو اس کی آنکھوں سے آنسو ٹپک رہے تھے "انکل' معاف کر دیں۔ آئندہ میں ناجائز رقم نہیں کماؤں گا۔ آپ صبح میرے ساتھ دفتر چلیں۔ میں آپ کے سامنے یہ رقم بھی ان لوگوں کو واپس کر دوں گا"۔

اگلے روز دفتر میں' شعیب نے ایک کاغذ انہی دونوں آدمیوں کی طرف بڑھایا اور کہا "یہ رہا جناب آپ کا بل میں نے اس پر دستخط کر دیئے ہیں اور یہ آپ کے چار ہزار روپے"۔

"کیا مطلب ہے سر" وہ حیران رہ گئے۔

"مطلب کچھ نہیں۔ بس آپ اپنی رقم اٹھائیں"۔ شعیب نے تیز آواز میں کہا۔

انہوں نے رقم اور بل اٹھایا اور شکریہ ادا کرتے ہوئے حیرت زدہ انداز میں باہر نکل گئے۔

چچا حیرت نے اٹھ کر کھڑے ہوتے ہوئے کہا: "شعیب بیٹا اٹھو"۔

شعیب کھڑا ہوا تو چچا حیرت نے اسے گلے سے لگا کر زور سے بھینچ ڈالا۔

☆☆☆

نوجوان ادیب' جن کی کہانیاں بچوں میں بے حد مقبول ہیں۔ آپ "تعلیم و تربیت" کے لیے باقاعدگی سے لکھتے ہیں اور اپنے اسلوب اور طرزِ تحریر کے حوالے سے بہت منفرد اور معروف ہیں۔

نیل شیر

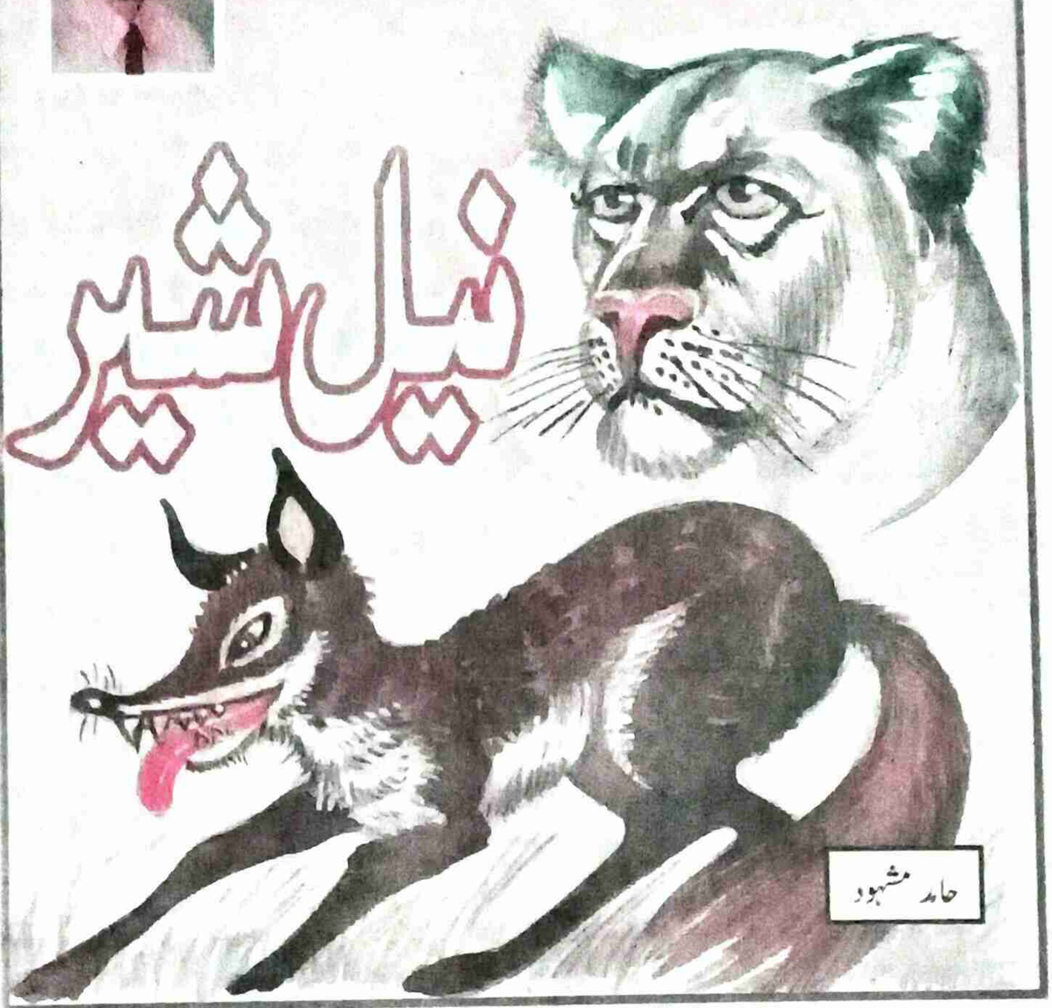

حامد مشہود

وہ ایک گھنا اور سرسبز و شاداب بیلا تھا۔ بیلا وہ جنگل ہوتا ہے جو کسی دریا یا نہر کے کنارے واقع ہو۔ اس بیلے میں ایک گرانڈیل گیدڑ رہتا تھا۔ وہ سدا کا نکما اور سست الوجود تھا' نہ کام کرتا اور نہ کاج' بس مفت کی روٹیاں توڑتا تھا۔ یہی وجہ تھی کہ وہ کنوارا ہی رہ گیا تھا۔ بیلے کی کوئی گیدڑی ایسے گیدڑ سے شادی پر تیار نہ تھی جو اس کے لیے اشیائے خوردو نوش فراہم نہ کر سکے۔ اس ہڈ حرام گیدڑ کا گزارا دوسرے جانوروں کے رحم و کرم پر ہو رہا تھا' کسی سے منت سماجت کر کے کچھ مانگ لیا اور کسی کا بچا کھچا کھا لیا۔ آخر کار اس نے لمبا ہاتھ مارنے کا ارادہ کیا۔

وہ گیدڑ محنت کے بغیر روزی حاصل کرنا چاہتا تھا۔ اس بیلے میں کوئی جگہ ایسی نہ تھی کہ اسے محنت کے بغیر گوشت موشت ملتا رہے اور ایسی جگہ کا پتا اسے ملتا نہ تھا جہاں ہاتھ پاؤں ہلائے بغیر "من و سلویٰ" کا نزول ہوتا ہو۔ اس لیے اس نے ایک انوکھا پروگرام تشکیل دیا۔

نکھٹو گیدڑ نے سیر بھر نیل پانی میں گھول کر خود کو مکمل طور پر رنگ لیا اور نیلا ہو کر شیروں کے جنگل کو چل دیا۔ شیر چھوٹے جنگل میں نہیں رہ سکتے۔ وہ اس بڑے جنگل میں رہتے ہیں جہاں انہیں وافر مقدار میں شکار مل سکے۔ گیدڑ شیر بڑے اور گھنے جنگل میں داخل ہوا تو اس کی مڈ بھیڑ ایک پلی پلائی جوان شیرنی سے ہوئی۔ وہ اسے دیکھ کر تعجب سے بولی "تم کون ہو بھئی؟"

"اور تم کون ہو؟" گیدڑ نے الٹا اس سے سوال کیا۔

"گھامڑ! دیکھتے نہیں ہو کہ میں شیرنی ہوں' جنگل کے بادشاہ' بلوان ببر شیر کی اکلوتی بیٹی"۔

"اور میں بھی شیر ہوں محترمہ!" گیدڑ نے طنزیہ انداز میں کہا۔

"ہائیں تم شیر ہو؟" شیرنی کے دیدے حیرت سے پھیل گئے۔

"ہاں...... تو اور کیا"

"اس طرح کا شیر میں نے اپنی زندگی میں پہلی بار دیکھا ہے۔ کمزور اور نیلا نیلا سا"۔ شیرنی حیران ہوتے ہوئے بولی۔

"میں نیل شیر ہوں"۔

"وہ کیا ہوتا ہے؟ تم نیل گائے کے عزیز ہو گیا"۔

"نیل شیر' شیروں کی ایک نسل ہوتی ہے۔ جس طرح ببر شیر' گل دار اور دھاری دار شیر وغیرہ شیروں کی مختلف قسمیں ہیں بالکل اسی طرح نیل شیر بھی ایک شیر ہوتا ہے۔ ہم پست قد ضرور

ہوتے ہیں' پست ہمت نہیں ہوتے۔ میں کئی لال پیلے بڑے نامور شیروں کو چاروں شانے چت گرا چکا ہوں۔ جنگل کے طاقت ور جانور' جنگلی بھینسا اور ہاتھی سب میرا احترام کرتے ہیں اور یہ چیتے ویتے تو میرے جوتے سیدھے کرتے ہیں۔ گینڈا میرا پانی بھرتا ہے الغرض ہر ایک نے میرا لوہا مانا ہوا ہے۔ باوجود اس قوت اور جوانی کے میں بڑوں کا دلی احترام کرتا ہوں اور چھوٹوں سے پر خلوص شفقت کا برتاؤ"۔

شیرنی ایسی چکنی چپڑی باتوں کی ماہر تو نہ تھی وہ سادہ لوح اس کی باتوں سے خوب متاثر ہوئی۔ اس نے اسے "نیل شیر" تسلیم کر لیا اور دوسرے روز جنگل میں خوب منگل ہوا۔ شیرنی کی شادی بہت دھوم دھام سے نیل شیر کے ساتھ قرار پائی۔ خوشی کی تمام رسومات شان و شوکت کے ساتھ ادا کی گئیں۔ شیرنی کی سہیلیوں نے نیل شیر پر اعتراض کیا کہ یہ کیسا جوان ہے تو شیرنی نے انہیں مطمئن کر دیا کہ لال شیر کے ساتھ تو ہر شیرنی کی شادی ہوتی ہے' نیل شیر کے ساتھ شادی کرنا انفرادیت کا باعث ہے۔

نیل شیر' شادی کے بعد مہینہ بھر آرام کرتا رہا اور شادی

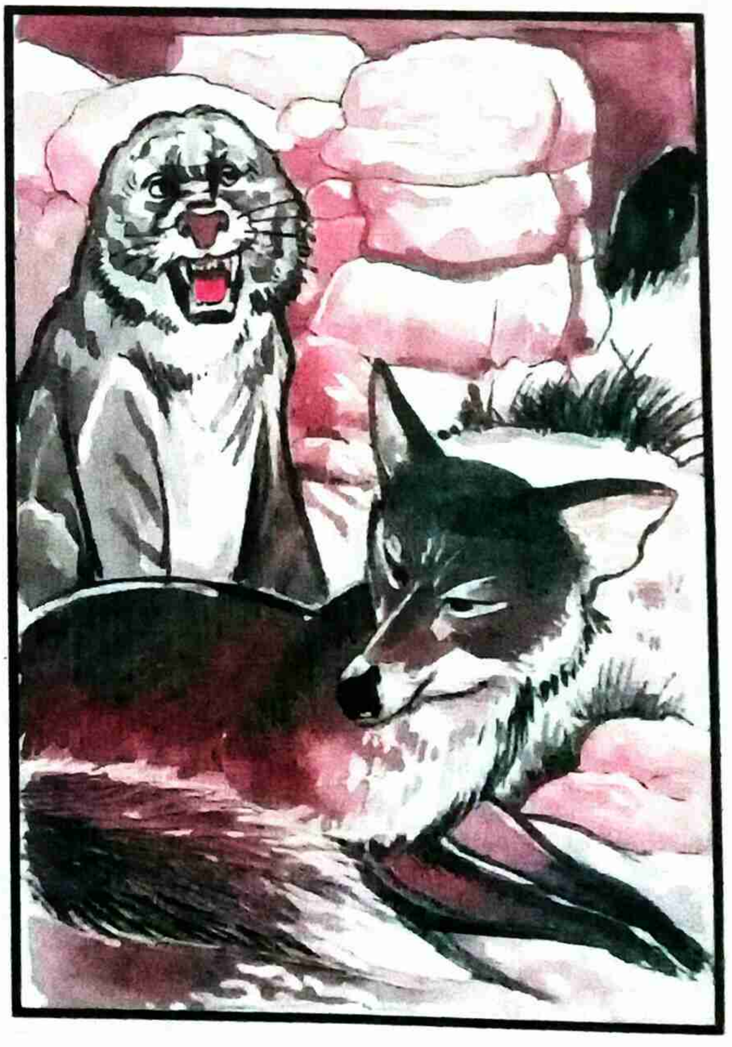

کے تحائف کھاتا پیتا رہا۔ وہ تحائف مختلف قسم کے لذیذ جانور تھے جو انہیں سوغات کے طور پر پیش کئے گئے تھے۔ جب وہ ذخیرہ ختم ہوا تو شیرنی نے دوپہر کے وقت بے سدھ سوئے ہوئے نیل شیر کو جھنجوڑ کر جگایا اور کہا "نیل شیر! جاؤ شکار کر کے لاؤ"۔ نیل شیر عاجزی سے بولا "ہمارے ہاں شیر نہیں بلکہ شیرنی شکار کرتی ہے"۔ شیرنی گرجی "تم اپنے خاندان کی روایات بھول جاؤ کیوں کہ تم ہمارے خاندان کے گھر داماد بن چکے ہو۔ ویسے بھی کما کر لانا شیر کا کام ہے' شیرنی کا دائرہ کار گھر تک محدود رہنا چاہیے۔ میں کچھار میں رہوں گی' کچھار سنبھالوں گی' بچے پالوں گی"۔

نیل شیر اپنی زوجہ محترمہ کو بد دعائیں دیتا ہوا چل دیا۔ وہ ہر کاہل شخص کی طرح اپنی قسمت کو کوس رہا تھا کہ ایسی قسمت کا بیڑا غرق' سوچا تھا شیرنی کا شکار کھا کر سویا کروں گا اور یہاں لینے کے دینے پڑ گئے۔ ساری دنیا کام کرتی ہے تو کیا ساری دنیا مل کر ایک آرام طلب فرد کا بوجھ برداشت نہیں کر سکتی؟

نیل شیر کافی دیر بعد شیرنی کی خدمت میں حاضر ہوا۔ اس کے پاس کسی چیتل کی دم تھی۔ اس نے دم شیرنی کو دے کر بتایا "نیک بخت! میں نے تاک لگا کر ایک جوان اور تگڑے چیتل پر حملہ کیا' وہ بھاگ نکلا۔ میں نے تلملا کر جب اس بزدل کی دم پکڑ کر اسے گھمایا تو وہ نہ جانے کہاں جا گرا۔ صرف اس کی دم میرے پاس رہ گئی ہے"۔

شیرنی نے اپنے سرتاج کی طاقت کی تعریف کی اور خود ایک چھوٹا ہرن مار لائی۔ نیل شیر نے سیر ہو کر مزے اڑائے اور لمبی تان کر سو رہا۔ دوسرے دن شیرنی نے اسے پھر رزق کی تلاش میں روانہ کر دیا۔ وہ بادل نخواستہ جنگل میں مارا مارا پھر رہا تھا کہ اسے کسی مردہ جانور کے سینگ مل گئے۔ اس نے وہ سینگ اٹھا کر اپنی کچھار کی راہ لی۔

نیل شیر نے اپنی شریک حیات کو وہ سینگ دے کر قصہ بیان کیا "بھاگ بھری! آج میں نے بڑا جانور قابو کیا۔ اس جانور نے اپنا دفاع کرتے ہوئے مجھ پر حملہ کرنے کی بھول کی تو میں نے اس جانور کے سینگ پکڑ کر اسے ایسا زور دار جھٹکا دیا کہ وہ جنگل کے نہ جانے کس گوشے میں جا گرا۔ صرف اس کے سینگ

میرے پاس رہ گئے ہیں"۔

شیرنی نے اپنے میاں کی بے پناہ قوت کو سراہا اور خود ایک پہاڑی بکرا مار لائی، نیل شیر نے جی بھر کر گل چھرے اڑائے اور گدھے گھوڑے بیچ کر سو رہا۔ تیسرے دن شیرنی اس قوی شیر کے ساتھ خود روانہ ہوئی تاکہ وہ دور جا کر گرنے والے شکار پر نظر رکھے اور گھر کی ہنڈیا نیل شیر کے دم سے ہی گرم ہو۔ راستے میں ایک ندی پڑتی تھی۔ نیل شیر ندی دیکھ کر ٹھٹک گیا اور آئیں بائیں شائیں کرنے لگا۔

"نیل شیر! ندی کے پار موٹے ہرن رہتے ہیں، ادھر جانا بہتر ہے" شیرنی نے کہا۔

"چلو تم چلی جاؤ" نیل شیر نے جان چھڑائی۔

"بھئی میں کیوں...... ہم دونوں جائیں گے۔ تم ندی پار کرو"۔ شیرنی نے کہا۔

میں نے چھلانگ لگائی تو نہ جانے کہاں جا کر گروں گا۔ تم مجھے کہاں ڈھونڈتی پھرو گی۔ "میں تجھے ڈھونڈ لوں گی"۔

"نہیں تم پہلے کود جاؤ"۔

آخر شیرنی نے بحث سے کنارہ کیا اور ندی کو چھلانگ لگا کر پار کیا پھر نیل شیر نے لمبی زقند، دور سے بھاگ کر پوری قوت سے بھری لیکن اس کا زور ٹوٹ گیا اور وہ ندی میں گر کر ڈبکیاں کھانے لگا۔ شیرنی نے اسے سہارا دے کر باہر نکالا تو اس کا نیل بہہ چکا تھا۔ ڈھول کا پول کھل گیا تھا اور شیر کے اندر سے گیدڑ نکل آیا تھا۔ پھر وہ خوف سے سچ مچ نیلا پڑ گیا۔ ایک ماہ کا عیش ہی اس کا منافع تھا۔

شیرنی نے اسے، فضا میں درختوں تک بلند کر کے بار بار زمین پر پٹخا اور پھر اس کا سر دونوں کانوں کے عین بیچ کر دیا۔ شیرنی نے گیدڑ کے کان کھینچ کر کہا "محنت سے جی چرانے والے ہمیشہ ذلیل و خوار ہوتے ہیں کیوں کہ ایسے کاہل لوگ ترقی کے لیے غلط راستہ اختیار کرتے ہیں اور ہر غلط راستہ ہمیشہ آخر پر بند ہی ہوتا ہے"۔

شیرنی نے گیدڑ کی گردن پر الوداعی طور پر ایسے دو ہنٹر جمائے کہ اسے چھٹی کا دودھ اور ساتویں کا مکھن یاد آ گیا۔ ہوش بجا ہونے پر چوٹوں سے نیلو نیل گیدڑ، آخر گرتا پڑتا اپنے بیلے تک پہنچ گیا اور کام چوری سے تائب ہوا کہ رزق حلال ہی میں عافیت ہے۔

☆ اس دن سے لفظ "نیل شیر" ایک محاوراتی طعنہ بن گیا ہے۔ جو شخص ہاتھ پاؤں توڑ کر کچھ کرنے کا صرف ارادہ ہی کرتا رہے یا اپنی اوقات سے بڑھ کر کوئی روپ دھار لے تو اسے "نیل شیر" کا خطاب دیا جاتا ہے۔

☆☆☆

ہمارے اور آپ سب کے جناب سعید لخت' جو گزشتہ پچاس ساٹھ سال سے بچوں کے لیے مزے مزے کی کہانیاں لکھ رہے ہیں۔ آپ کی تحریریں سادہ اور دلچسپ ہونے کے باعث اپنا جواب نہیں رکھتیں۔ آپ "تعلیم و تربیت" کی ادارت کی نسبت سے بچوں میں "چچا جان" کے نام سے مشہور ہیں۔

چھانگا مانگا کے جنگل میں ایک بوڑھا الو رہتا تھا' بہت عقل مند' نیک اور خدا ترس۔ جنگل کے کسی جانور پر کوئی بپتا پڑتی تو وہ دوڑا دوڑا میاں الو کے پاس آتا اور وہ چٹکی بجاتے میں اس کی مشکل آسان کر دیتے۔ تمام جانور انہیں ادب سے گرو جی کہتے تھے۔ گرو جی روز شام کو دربار لگاتے اور جانور ان کے سامنے اپنا اپنا دکھڑا روتے۔ جس دن کوئی مصیبت کا مارا نہ آتا اس دن گرو جی جانوروں کو کوئی دلچسپ کہانی سناتے۔

شام ہوتے ہی تمام جانور میاں الو کے گھونسلے کے نیچے جمع ہو گئے اور "گرو جی زندہ باد" کے نعروں سے سارا جنگل سر پر اٹھا لیا۔ تھوڑی دیر بعد گرو جی بڑی شان سے باہر نکلے' کھنکار کر گلا صاف کیا' دو چار جمائیاں لیں اور پھر مینا کو دیکھ کر حیرت سے بولے "بی بی اس سے پہلے میں نے تمہیں یہاں کبھی نہیں دیکھا۔ تمہارا نام کیا ہے؟"

مینا بولی "منھنجو نالو شہلا چند رانی آھے' سائیں"۔

ہاتھی نے کہا "اوے! اے کیہڑی بولی بولدی اے؟"

گائے بولی "یہ سندھی زبان ہے' اپنے دیس کی زبان۔ شہلا سندھ کی رہنے والی ہیں۔ کہتی ہیں میرا نام شہلا چند رانی ہے۔ گرو جی تعجب سے بولے "بی گائے تمہیں سندھی زبان آتی ہے؟"

گائے نے کہا "انہی سے سیکھی ہے اور میں انہیں پنجابی سکھا رہی ہوں"۔

گرو جی خوش ہو کر بولے "جیتی رہو اور یاد رکھو! چمن میں طرح طرح کے پھول کھلتے ہیں۔ ہر پھول کی رنگت اور خوشبو الگ الگ ہوتی ہے مگر وہ سب پیار اور محبت سے رہتے ہیں۔ ہم سب بھی ایک ہی چمن کے پھول ہیں۔ رنگ اور بو الگ الگ مگر گھر سب کا ایک۔ کیا سمجھے؟"

"سب سمجھ گئے" لومڑی نے کہا "اب آپ جلدی سے کوئی پھڑکتی ہوئی کہانی سنا دیجیے"۔

گرو جی نے کچھ سوچا اور پھر بولے "ایک دن کا ذکر ہے دوپہر کا وقت تھا۔ میں بے خبر پڑا سو رہا تھا کہ بی فاختہ نے آ کر جگا دیا۔ میں نے پوچھا "کہو بی فاختہ اس وقت کیسے آنا ہوا؟ خیر تو ہے؟"

"اجی گرو جی" وہ چونچ ہلا کر بولی "آپ کے جنگل کے درخت ایک ایک کر کے غائب ہو رہے ہیں اور اگر تھوڑے دنوں میں یہی حالت رہی تو سارا جنگل صفاچٹ میدان بن جائے گا"۔

"یہ تو بڑے اچنبھے کی بات ہے" میں نے کہا "لیکن تمہاری رائے میں درختوں کے غائب ہونے کی وجہ کیا ہے؟"

"میں آپ کو بتاتی ہوں" فاختہ ادھر ادھر دیکھ کر بولی "یہ ساری شرارت اس کھٹ بڑھئی کی ہے جو ہمارے پڑوس میں رہتا ہے"۔

میں نے ہنس کر کہا "تمہارا مطلب ہے کہ کھٹ بڑھئی درخت اٹھا کر لے جاتا ہے؟ بی فاختہ کیسی بہکی بہکی باتیں کرتی ہو"۔

"آپ یقین نہیں کرتے" فاختہ نے کہا "مگر مجھے یقین ہے کہ یہ ساری کارستانی کھٹ بڑھئی ہی کی ہے۔ گرو جی آپ کو پتا نہیں یہ کھٹ بڑھئی بڑی موذی قوم ہے۔ یہ درختوں کو کھوکھلا کر کے گرا دیتے ہیں اور پھر اٹھا کر کہیں دور پھینک آتے ہیں۔ ذرا خیال فرمایئے اگر انہیں کھلی چھٹی دے دی گئی تو جنگل میں ایک درخت بھی نہیں رہے گا۔ میری رائے میں آپ جنگل کے جانوروں کی ایک میٹنگ بلایئے اور کھٹ بڑھیوں کو الٹی میٹم دے دیجیے کہ چوبیس گھنٹے کے اندر اندر اس جنگل سے چلے جائیں ورنہ ہم ان کا گھیراؤ کر لیں گے"۔

میں نے زور کا قہقہہ لگایا اور بولا "بی فاختہ معلوم ہوتا ہے تم بے چارے کھٹ بڑھئی سے کسی بات پر ناراض ہو گئی ہو۔ اری خدا کی بندی ذرا سوچ تو سہی۔ کھٹ بڑھئی جیسا ذرا سا پرندہ اتنے بڑے پیڑ کو کس طرح گرا سکتا ہے؟ اس میں شک نہیں کہ وہ کیڑے مکوڑے کھانے کے لیے درختوں میں سوراخ کرتا ہے مگر یہ سوراخ اتنے ننھے ہوتے ہیں کہ ان سے درخت کا کچھ نہیں بگڑتا۔ گرنا تو بڑی بات ہے"۔

فاختہ نے نفرت سے سر ہلایا اور بولی "آپ یقین نہیں کرتے نہ کیجیے۔ بتا دینا میرا کام تھا۔ میں اب جاتی ہوں"۔

"بات تو سنو" میں نے اُسے روکتے ہوئے کہا "کسی پر الزام لگانے سے پہلے خوب چھان بین کر لینی چاہیے۔ میرا خیال ہے یہ کام کسی آدمی کا ہے۔ ہو سکتا ہے سرکار کو لکڑی کی ضرورت ہو اور وہ درخت کٹوا رہی ہو"۔

"جی نہیں یہ کسی انسان کا کام نہیں" فاختہ نے کہا "اگر کوئی آدمی درخت کاٹتا تو جانور ضرور دیکھتے۔ لیکن جانوروں نے کسی آدمی کو درخت کاٹتے ہوئے نہیں دیکھا"۔

"ارے بھئی یہ واقعہ تو الف لیلہ کی کہانیوں سے بھی زیادہ حیرت انگیز ہے" میں نے سر کھجاتے ہوئے کہا "اچھا میں کھٹ بڑھئی کے پاس جاتا ہوں۔ تم اپنے گھر جاؤ۔ کوئی نئی بات معلوم ہوئی تو تمہیں بتا دوں گا۔" یہ سن کر فاختہ چلی گئی۔

تھوڑی دیر بعد میں کھٹ بڑھئی کی تلاش میں روانہ ہوا۔ اِدھر اُدھر گھومتے ہوئے چند منٹ ہی گزرے تھے کہ شیشم کے ایک پیڑ سے کھٹ کھٹ کی آواز آئی۔ کھٹ بڑھئی بڑی تیزی سے درخت میں سوراخ کرنے میں مشغول تھا۔ میں پاس ہی ایک شاخ پر بیٹھ گیا اور مسکرا کر بولا "بڑے مصروف نظر آ رہے ہو میاں"۔

وہ مجھے دیکھ کر چونکا اور پھر بولا "جی ہاں فرمایئے کیسے تشریف لائے؟"

"تمہاری ہی تلاش میں تھا بھائی" میں نے کہا "شکر ہے کہ مل گئے۔ دراصل میں تم سے کچھ پوچھنا چاہتا ہوں"۔

کھٹ بڑھئی میرے پاس بیٹھتے ہوئے بولا "فرمایئے کیا بات ہے؟"

میں نے اسے درختوں کے غائب ہونے کا قصہ سنایا اور بتایا کہ فاختہ کے خیال میں تم درخت غائب کر دیتے ہو۔

وہ بڑے زور سے ہنسا اور بولا "مجھ سا کمزور پرندہ درخت کس طرح گرا سکتا ہے گرو جی؟ اور پھر میں دن میں کام کرتا ہوں۔

اگر میں درخت گراتا تو تمام جانور دیکھتے۔

"سچ کہتے ہو بھائی" میں نے کہا "آج رات ہم دونوں جنگل کی چوکیداری کریں گے۔ روز کی طرح آج بھی درختوں کو غائب کرنے والا جادوگر ضرور آئے گا اور پھر ہمیں معلوم ہو جائے گا کہ یہ کس کی شرارت ہے"۔

رات کو کھانا کھا کر میں کھٹ بڑھئی کے گھر گیا۔ وہ بالکل تیار بیٹھا تھا۔ ہم دونوں جنگل میں ادھر ادھر گھومنے لگے۔ ایک گھنٹا' دو گھنٹے' تین گھنٹے یہاں تک کہ آدھی رات گزر گئی مگر کوئی شخص نظر نہ آیا۔ ہم مایوس ہو کر لوٹنے ہی والے تھے کہ اچانک ایک جگہ پتوں کے کھڑکھڑانے کی آواز آئی۔ ہم فوراً اڑتے ہوئے ادھر پہنچے۔ چار آدمی دھیرے دھیرے ایک درخت کی طرف بڑھ رہے تھے۔ سب سے آگے والے آدمی کے ہاتھ میں لالٹین تھی دوسرے کے ہاتھ میں آرا تھا' تیسرے کے ہاتھ میں موٹی سی رسی تھی اور چوتھا کلہاڑا لیے ہوئے تھا۔

ایک درخت کے پاس پہنچ کر چاروں ٹھہر گئے۔ کلہاڑے والے شخص نے درخت کی جڑ میں چار پانچ ضربیں لگائیں اور پھر دو شخصوں نے مل کر آرا چلانا شروع کر دیا۔ جب تین چوتھائی سے زیادہ جڑ کٹ گئی تو انہوں نے ایک موٹی سی شاخ میں رسی پھنسا کر زور سے کھینچا۔ درخت دھڑام سے نیچے گر پڑا۔ اس کے بعد انہوں نے جلدی جلدی اس کی شاخیں کاٹ کر تنے کے تین چار ٹکڑے کیے اور ان کو لڑھکا کر جنگل کے باہر لے گئے جہاں ایک بیل گاڑی کھڑی تھی۔

"یہ چاروں سگے بھائی ہیں"۔ میں نے کھٹ بڑھئی کے کان میں کہا "قصبے میں ان کی ٹال ہے"۔

"تو یہ کم بخت سرکاری لکڑی چرا کر فروخت کرتے ہیں؟" کھٹ بڑھئی بولا "مگر انہیں پکڑا کیسے جائے؟"

میں نے کہا "ایک ترکیب ہے انہیں پکڑنے کی ہم کسی طرح پولیس کو یہاں لے آئیں"۔

"لیکن یہ کیسے ہو سکتا ہے گرو جی؟" کھٹ بڑھئی بولا "ہم پولیس کو اپنا مطلب کیسے سمجھائیں گے؟"

"یہی تو مصیبت ہے" میں نے کہا "میں تھوڑی بہت اردو جانتا ہوں۔ لیکن مشکل یہ ہے کہ مجھے انسانوں کی طرح بولتا دیکھ کر پولیس والے تھانہ چھوڑ کر بھاگ جائیں گے۔ خیر تم اب گھر جاؤ۔ کل شام تک ممکن ہے میرے دماغ میں کوئی ترکیب آجائے"۔

خدا کی شان دوسرے دن شام ہونے سے پہلے پہلے میرے ذہن میں ایک نہایت ہی عمدہ تدبیر آگئی۔ دوڑا دوڑا کھٹ بڑھئی کے گھر گیا اور اسے وہ تدبیر بتائی۔ مارے خوشی کے اس کی باچھیں کھل گئیں۔ اب ہم دونوں جانی کتے کی تلاش میں نکلے اور تھوڑی سی دوڑ دھوپ کے بعد اسے بھی ڈھونڈ نکالا۔

جب رات کے بارہ بج گئے اور میں نے دیکھا کہ چور جنگل میں داخل ہو گئے ہیں تو ہم تینوں قصبے کے تھانے پہنچے۔ تھانے کا دروازہ بند تھا اور ایک سپاہی دروازے کے پیچھے مونڈھے پر بیٹھا اونگھ رہا تھا۔ میں نے جانی سے کہا "دیکھو! کھٹ بڑھئی دروازہ کھٹکھٹائے گا۔ کھٹ کھٹ کی آواز سن کر سپاہی باہر آئے تو تم اس کی قمیص پکڑ کر کھینچنا۔ اس کے دل میں ضرور شبہ پیدا ہو گا اور وہ تمہارے پیچھے پیچھے ہو لے گا۔ میں تمہارے سر پر اڑ رہا ہوں گا۔ جدھر میرا رخ ہو تم سپاہی کو ادھر ہی لے چلنا۔ سمجھ گئے؟"

جانی نے دم ہلا کر "ہاں" کہا۔

میں نے کھٹ بڑھئی کو اشارہ کیا اور اس نے اپنی چونچ سے دروازے پر دستک دینی شروع کر دی۔ اونگھتا ہوا سپاہی آنکھیں ملتا ہوا اٹھ بیٹھا اور ڈانٹ کر بولا "کون ہے؟" لیکن جواب نہ پا کر پھر بیٹھ گیا۔ کھٹ بڑھئی نے دوبارہ دستک دی "کھٹ' کھٹ' کھٹ"۔

اب کے سپاہی جھلا کر اٹھا اور دروازہ کھول کر بولا۔

"یہ کوئی وقت ہے رپٹ لکھوانے کا؟ چل' بھاگ یہاں سے۔ صبح کو آنا"۔

جانی نے لپک کر اس کی پتلون دانتوں سے پکڑ لی اور کوں کوں کر کے کھینچنے لگا۔ سپاہی شور مچانے لگا۔ گڑ بڑ سن کر دوسرے سپاہیوں کی بھی آنکھ کھل گئی اور وہ دوڑے ہوئے آئے۔ ایک سپاہی کے ہاتھ میں ڈانڈا تھا۔ اس نے جانی کی ٹانگوں پر زور سے ڈنڈا رسید کیا۔ غریب جانی مار کھا کر پیچھے ہٹا مگر پھر کوں کوں کر کے آگے بڑھا اور سپاہیوں کو اپنے پیچھے آنے کے لیے اشارے کرنے لگا۔ اتنے میں تھانے دار بھی آگیا۔ وہ کچھ سمجھ دار تھا۔ اس نے جانی

کو اُچھلتے کودتے اور اشارے کرتے دیکھا تو بولا "ضرور کچھ گڑ بڑ ہے۔ آؤ چلو دیکھیں۔ کہاں لے چلتا ہے؟"

سپاہی بندوق اور لاٹھیاں لے کر باہر آگئے اور جانی کے پیچھے پیچھے چلنے لگے۔ تھوڑی ہی دیر میں ہم جنگل میں پہنچ گئے اور

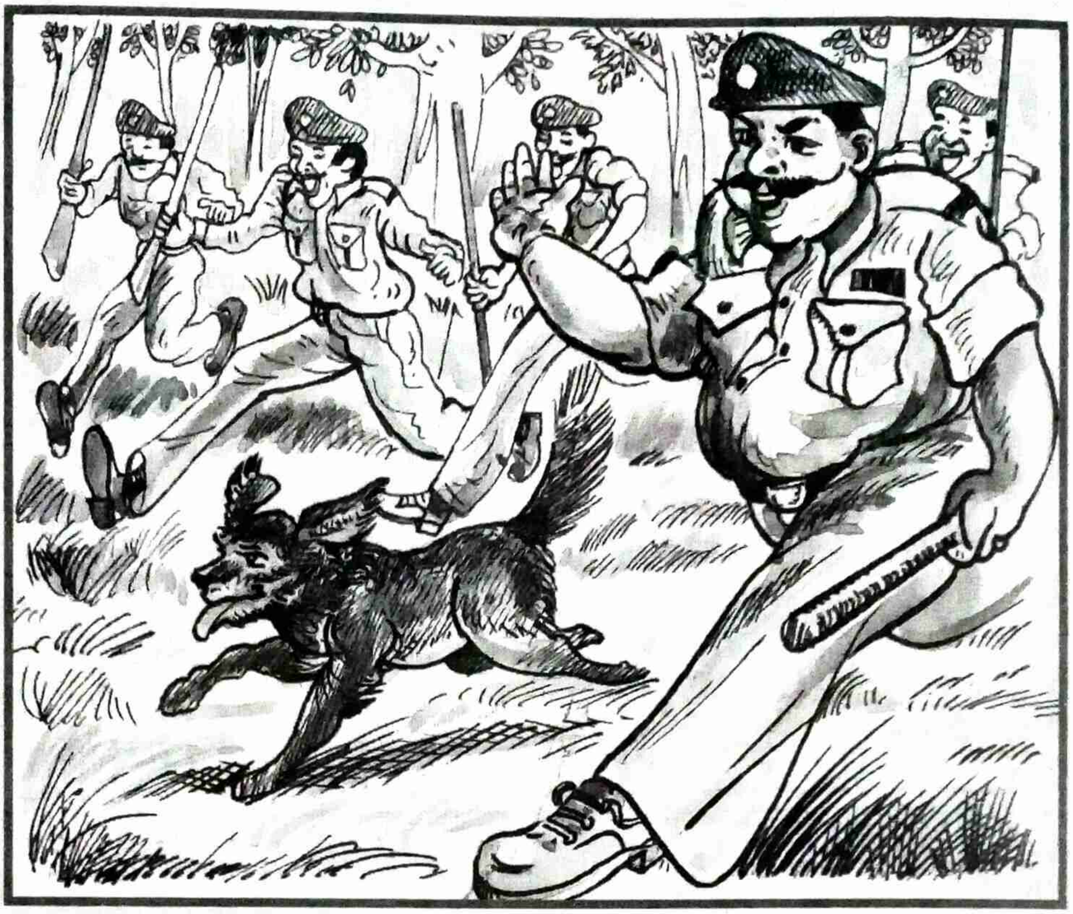

اس طرح پولیس نے ان چوروں کو عین موقع پر پکڑ لیا۔ تھانے دار کو کیا خبر کہ چوروں کو پکڑوانے والا ایک اُلو ہے۔ وہ سمجھتا تھا کہ جانی انہیں پکڑوا رہا ہے۔ وہ جانی کو تھانے لے گیا اور وہاں اس کی دودھ جلیبیوں سے خاطر کی۔

"اور آپ کو کچھ بھی نہیں ملا گروجی" گائے نے پوچھا۔ "مجھے کیا ملتا" گروجی نے کہا "دوسرے دن جانی ملا تو میں نے اس سے کہا "کیوں بھائی' ترکیب ہم نے لڑائی اور دودھ جلیبیاں کھائیں تم نے"۔

اس نے ہنس کر کہا "ڈنڈے بھی تو میں نے ہی کھائے تھے گروجی"۔ اچھا بھئی' اب اپنے اپنے گھروں کو جاؤ۔ رات زیادہ ہو گئی ہے۔ کل میں تمہیں ایک اور قصہ سناؤں گا"۔

☆☆☆

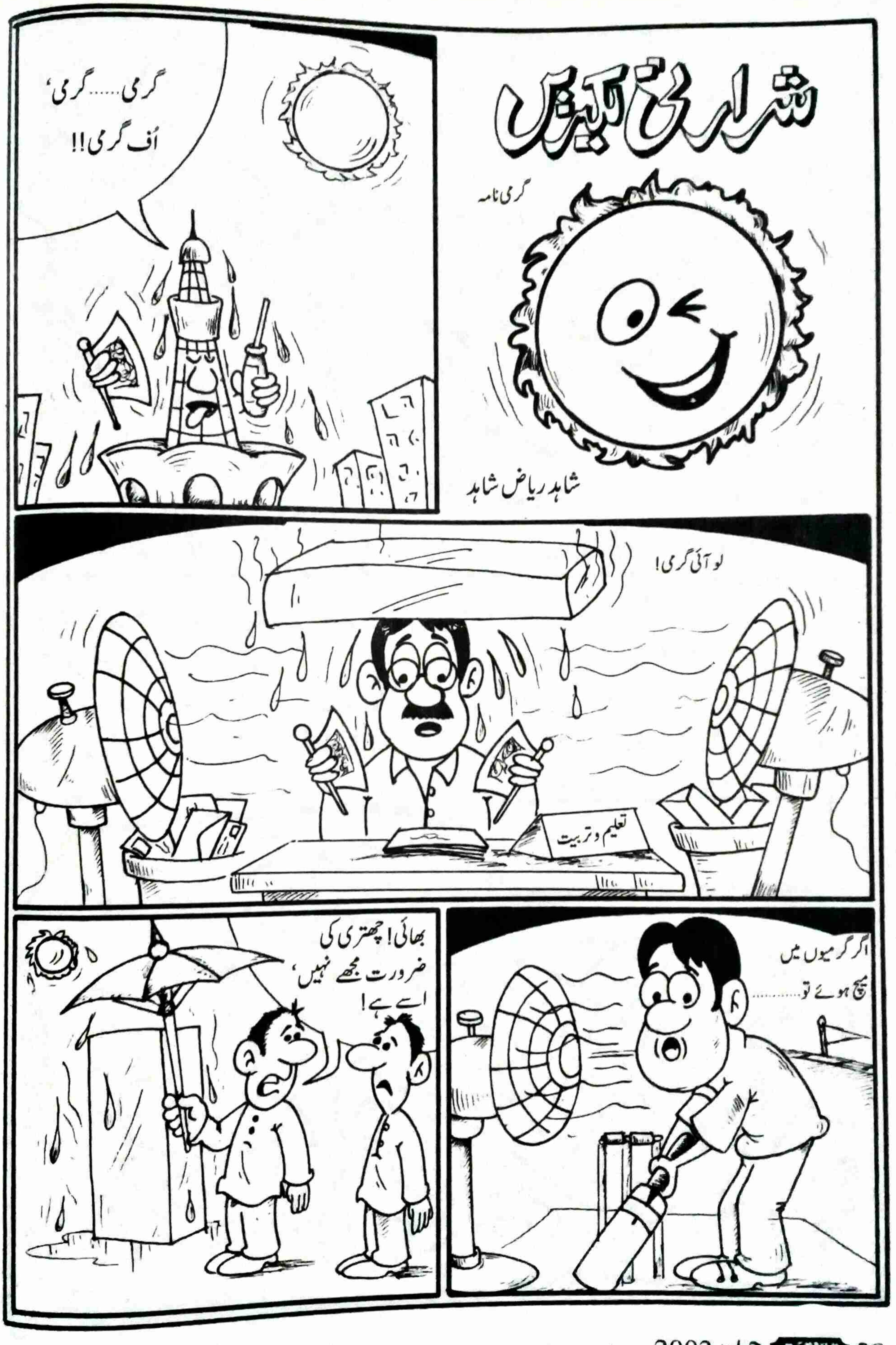
شرارتی کارٹون
گرمی نامہ
شاہد ریاض شاہد
گرمی......گرمی،
اُف گرمی!!
لو آئی گرمی!
تعلیم و تربیت
اگر گرمیوں میں
میچ ہوئے تو......
بھائی! چھتری کی
ضرورت مجھے نہیں،
اسے ہے!

پاکستان براڈکاسٹنگ کارپوریشن سے وابستہ رہے۔ کچھ عرصہ بی بی سی لندن میں بھی فرائض انجام دیتے رہے۔ سائنس فکشن کے حوالے سے آپ کا نام اور کام بخوبی جانا پہچانا جاتا ہے۔ آپ کی کہانیاں بچوں اور بڑوں میں بہت مقبول ہیں۔

سائنس فکشن

روبوٹ کہانی

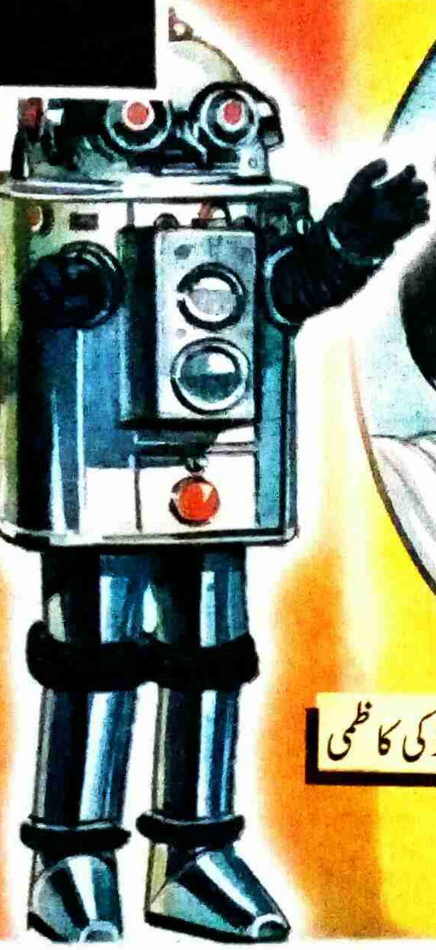

ہر فن مولا

حسن ذکی کاظمی

حمزہ اسکول سے لوٹا تو لان میں کرسی پر بیٹھے ہوئے کسی اجنبی نے اسے دیکھ کر ہاتھ ہلایا۔ حمزہ نے بھی اسی انداز سے ہاتھ ہلایا اور جلدی سے اندر چلا گیا۔ ممانی کچن میں مصروف تھیں۔ وہ ان کے پاس گیا اور پوچھنے لگا "ممانی یہ لان میں کون آدمی بیٹھا ہے؟"

ممانی نے ککر بند کرتے ہوئے کہا "آدمی نہیں روبوٹ ہے۔ بتا رہا ہے کہ اسے شہلا نے بھیجا ہے تمہارے کمرے کی صفائی کے لیے"۔

حمزہ چونک پڑا اور بولا "ہاں ہاں' یاد آیا۔ سسٹر شہلا نے کہا تھا کہ وہ ہوسٹل سے ایک ہیلپر بھیجیں گی کمرے کی صفائی کے لیے"۔ ممانی کو شاید یہ بات پسند نہیں آئی۔ کہنے لگیں:

"بھلا کمرے کی صفائی کے لیے شہلا سے کہنے اور روبوٹ ہیلپر بلانے کی کیا ضرورت تھی؟ آخر کوئی نہ کوئی کر ہی دیتا تھا کمرے کی صفائی"۔

حمزہ نے ممانی کے لہجے کی سختی کو محسوس کرتے ہوئے جلدی سے جواب دیا "ممانی میں نے سسٹر شہلا سے کچھ نہیں کہا۔ ہوا یہ کہ انہوں نے ویڈیو فون پر مجھ سے بات کی تو اپنے اسکرین پر میرے کمرے کی حالت دیکھی اور کہنے لگیں کہ وہ کمرہ ٹھیک کرنے کے لیے روبوٹ ہیلپر بھیجیں گی۔ میں نے اس لیے ان کی بات مان لی کہ ذرا دیکھیں تو یہ روبوٹ کس طرح کام کرتا ہے۔ میں نے یہ بھی سوچا کہ اگر تجربہ کامیاب رہا تو آپ کے لیے بھی آسانی ہو جائے گی۔ ہیلپر آپ کا بھی ہاتھ کبھی کبھی بٹا دیا کرے گا"۔

یہ سن کر ممانی ذرا نرم پڑ گئیں اور کہنے لگیں:

"اچھا ٹھیک ہے۔ تم اسے کمرے میں لے جاؤ۔ ہم بھی دیکھیں کیسا رہتا ہے یہ تجربہ۔ ویسے بیگم شیرازی بتا رہی تھیں کہ روبوٹس گھر کا کام خوب کر لیتے ہیں۔ بس ذرا مہنگا ہے یہ کام ہماری حیثیت سے شاید زیادہ ہو"۔

حمزہ تیزی سے چلتا ہوا لان میں پہنچا اور ہیلپر کی طرف ہاتھ بڑھاتے ہوئے کہا "میرا نام حمزہ ہے"۔ ہیلپر نے ہاتھ ملاتے ہوئے مسکرا کر کہا:

"میں جانتا ہوں۔ میں نے آپ کو ایک دو بار اپنے ہوسٹل میں دیکھا ہے...... اور میرا نام ہے جیک"۔

حمزہ نے فوراً کہا "جیک یا جیک آف آل ٹریڈز (Jack of all trades)؟ یعنی ہر فن مولا"۔

ہیلپر ہنس دیا اور کہنے لگا "آپ چاہیں تو جیک آف آل ٹریڈز بھی کہہ سکتے ہیں۔ تھوڑا بہت ہر کام ہی کر لیتا ہوں۔ آیئے اب آپ کے کمرے کی طرف چلیں"۔

حمزہ نے سر سے پیر تک جیک کو بہت غور سے دیکھا اور بولا: "آپ واقعی کمرے کی صفائی کر لیں گے اور سب چیزیں ٹھیک سے رکھ دیں گے"۔ میرا مطلب ہے کوئی پرابلم تو نہیں ہو گی؟"

جیک نے بڑی بھونڈی آواز میں ہنسنا شروع کیا۔ وہ کچھ کہنا چاہتا تھا لیکن ہنسی کی وجہ سے کچھ نہ کہہ سکا۔ حمزہ کو اس کی اتنی لمبی ہنسی پر تعجب ہونے لگا اور اس نے حیران ہو کر پوچھا۔

"کیا میں نے کوئی بہت عجیب بات کہہ دی جو آپ کو ایسی زبردست ہنسی آگئی؟"

جیک نے مشکل سے ہنسی ضبط کی اور بولا: "حمزہ صاحب! ہنسی اس بات پر آئی کہ آج کے زمانے میں روبوٹ مشکل سے مشکل کام کر رہے ہیں۔ آپ کی زمین سے لے کر خلا تک روبوٹس نے اپنی ذہانت اور بہترین کارکردگی کا لوہا منوالیا ہے۔ ان گنت کام ایسے ہیں جنھیں کرتے ہوئے انسان گھبراتا ہے لیکن روبوٹ انھیں بڑی مہارت سے کر لیتا ہے۔ کارخانہ ہو، ہسپتال ہو، تجربہ گاہ ہو، اسکول کالج ہوں، جنگ کا محاذ ہو یا خلائی تحقیق ہو۔ ہر جگہ روبوٹ آگے آگے ہے اور آپ ہیں کہ ابھی اس بات میں بھی شک کر رہے ہیں کہ میں کمرے کی صفائی کر سکوں گا یا شاید آپ کو گھریلو روبوٹس کے بارے میں زیادہ معلوم نہیں"۔ یہ کہہ کر جیک پھر زور سے ہنسا اور حمزہ کچھ شرمندہ سا ہو گیا۔ جیک نے گھاس پر رکھا ہوا اپنا بیگ اٹھایا جس میں صفائی کی مشین تھی اور پھر دونوں کمرے کی طرف چل پڑے۔

جیک نے صفائی شروع کی تو ساتھ ساتھ حمزہ سے باتیں بھی کرتا رہا: "حمزہ صاحب دراصل گھریلو کام کرنے والے روبوٹس تو پچھلی صدی کے درمیانی زمانے میں ہر طرف استعمال ہونے لگے تھے لیکن ان کی شکل مشینوں جیسی تھی اور وہ ایک ایک کام کرتے تھے۔ کوئی قالین اور فرش سے گرد صاف کرتا، کوئی کپڑے دھوتا، کوئی باغ میں گھاس کاٹتا اور پودے تراشتا۔ رفتہ رفتہ ان کی شکل بدلتی رہی اور کام بہتر ہوتا گیا اور پھر بیسویں صدی کے آخر میں ایسے گھریلو روبوٹس بننے لگے جو شکل صورت میں انسان جیسے

تھے اور وہ کئی کئی کام کر سکتے تھے۔ اس ایجاد میں جاپان آگے آگے تھا۔ اب اکیسویں صدی کے بھی بیس سال گزر چکے اور اب گھریلو کام کے لیے ایسے روبوٹ بن رہے ہیں جو انسان سے بالکل ملتے جلتے ہیں اور کام بھی اسی کی طرح کرتے ہیں۔ اب آپ مجھے ہی دیکھیے۔ میں نے مانا کہ میری شکل اتنی اچھی نہیں جتنی آپ کی ہے لیکن ہاتھ پیر میں آپ سے کم نہیں"۔

حمزہ کی توجہ جیک کی باتوں کی طرف اتنی نہیں تھی جتنی کہ اس کے کام کی طرف۔ وہ حیران ہو کر جیک کی پھرتی اور کام دیکھ رہا تھا۔ اس نے دیکھا کہ کھڑکی کا پردا ہٹا کر ممانی بھی بڑی حیرت سے جیک کو دیکھ رہی تھیں۔ حمزہ نے ان کی طرف دیکھا تو انہوں نے تعریفی انداز میں گردن ہلائی۔ کام ختم کر کے جیک نے اپنی چیزیں بیگ میں بند کیں اور بولا:

"ہاں اب بتائیے آپ کو کام پسند آیا؟"

حمزہ کے منہ سے بے اختیار نکلا "ونڈر فل"۔

جیک نے جاپانی انداز میں سر جھکا کر شکریہ کہا اور پھر اپنی کہانی شروع کر دی: "دراصل گھریلو روبوٹس کا زور اس وقت ہوا جب جاپانی سائنس دانوں نے انہیں اس قابل بنا دیا کہ وہ اونچی نیچی زمین پر چل سکیں، زینہ چڑھ سکیں، آسانی سے مڑ سکیں اور جھک سکیں، راستے کی رکاوٹوں کو ہٹا سکیں اور اگر ٹھوکر لگے تو سنبھل سکیں یعنی اپنا توازن قائم رکھ سکیں۔ یہ ساری باتیں آپ کے اس خادم میں موجود ہیں۔ ذرا آزمائیے۔ مجھے دھکا دیجیے اور پھر دیکھیے میں کیسے سنبھلتا ہوں۔ دیجیے دھکا"۔

حمزہ نے ذرا تکلف نہ کیا اور اس کی کمر پر ہاتھ رکھ کر اسے آگے دھکیلا۔ جیک لڑکھڑایا لیکن تھوڑا سا آگے جھکنے کے بعد سنبھل گیا اور کہنے لگا:

"اور اب میں آپ کو دھکا دوں گا تو آپ کو میری طاقت کا اندازہ ہو گا"۔ حمزہ کو یہ بے تکلفی پسند نہ آئی۔ اسے روبوٹ سے ہاتھ ملا کر ہی اس کی طاقت کا اندازہ ہو گیا تھا۔ وہ چند قدم پیچھے ہٹا اور بولا: "نہیں نہیں...... رہنے دیجیے۔ مجھے اندازہ ہے آپ کی طاقت کا"۔

جیک نے مسکرا کر کہا۔ "حمزہ، اندازے سے کام نہیں چلے گا۔ ذرا آزما کر دیکھیے۔ اچھا چلیں پنجہ ہی لڑا لیں"۔ یہ کہہ کر وہ حمزہ کے پنجے میں اپنا پنجہ ڈالنے ہی والا تھا کہ ممانی کمرے میں آگئیں اور اس کی بچت ہو گئی۔ ممانی نے کمرے پر ادھر ادھر نظر ڈالی اور بولیں:

"ارے یہ تو کمال ہی کر دیا آپ نے...... وہ کیا نام ہے آپ کا؟" جیک نے سر جھکا کر شکریہ ادا کیا اور کہا "جی جیک ہے میرا نام"۔

"واہ واہ...... آپ نے بڑے سلیقے سے کیا ہے ہر کام۔ ارے بھئی آپ تو بڑے کام کے آدمی...... میرا مطلب ہے بڑے کام کے روبوٹ ہیں"۔

ممانی ابھی کچھ اور تعریف کرنے کے موڈ میں تھیں لیکن حمزہ بتانے لگا "ارے ممانی یہ اور کام بھی جانتے ہیں۔ یہ جیک آف آل ٹریڈز ہیں"۔

ممانی خوش ہو کر بولیں "ارے تو کچھ بتائیے نا اپنے بارے میں"۔

جیک نے سر جھکا کر کہا "میڈم' باقی باتیں آئندہ ملاقات میں بتاؤں گا۔ اس وقت مجھے ایک اور جگہ کام لیے پہنچنا ہے۔ میں اس وقت ڈیوٹی پر ہوں۔ بہرحال میں آپ کو یقین دلاتا ہوں کہ آپ کی کافی خدمت کر سکتا ہوں اور معاوضہ بہت مناسب ہو گا۔ ظاہر ہے پیسہ ہمارے لیے تو بے کار ہی ہے۔ جو بھی معاوضہ ملتا ہے روبوٹس ہوسٹل کے فنڈ میں چلا جاتا ہے اور یہ معاوضہ زیادہ نہیں ہوتا"۔ یہ کہہ کر جیک حمزہ سے کہنے لگا:

"اس وقت جو کام میں نے کیا ہے اس کا بل آپ کو ہوسٹل سے بھیج دیا جائے گا۔ اب میں چلتا ہوں۔ جب میری ضرورت ہو تو ہوسٹل کے فون نمبر کی ایکسٹنشن 444 پر بکنگ کرا دیجیے گا"۔ یہ کہہ کر اس نے اپنے اسکوٹر کی طرف بڑھنا شروع کیا جو گیٹ کے پاس کھڑا تھا۔

چند روز بعد حمزہ شہلا سے ملنے ہوسٹل پہنچا تو شہلا اسے دیکھ کر بولی: "بڑے اچھے موقع پر آئے ہو۔ اس وقت اتفاق سے مسٹر میسن بھی آئے ہوئے ہیں۔ نیچے اپنے لیے کافی لینے گئے ہیں۔ ابھی آتے ہیں"۔

یہ سن کر حمزہ خوش ہو گیا۔ کہنے لگا "لیکن یہ بتائیے کہ اس وقت وہ فوجی ہیں یا روبوٹ یا مسٹر میسن؟"

شہلا نے مسکرا کر کہا "گھبراؤ نہیں۔ اس وقت وہ اپنے اصلی روپ میں ہیں"۔

یہ بات ہو ہی رہی تھی کہ مسٹر میسن آگئے اور حمزہ کو دیکھ کر خوش ہوتے ہوئے بولے: "کیسا اتفاق ہے کہ آج ہی ڈاکٹر کوہی سے تمہارے بارے میں بات ہوئی اور چند گھنٹے بعد تم سے ملاقات بھی ہو گئی۔ جب سے ہسپتال میں تم سے ملاقات ہوئی تھی میں تم سے بہت متاثر تھا۔ تم ذہین ہو اور علم حاصل کرنے کا تمہیں بہت شوق ہے اور تم تمیز دار بھی ہو۔ اب تو میری اور تمہاری دوستی پکی ہو جائے گی کیوں کہ ڈاکٹر کوہی بتا رہے تھے کہ تم میرے بارے میں بہت سی باتیں جاننا چاہتے ہو"۔

حمزہ نے جھجکتے ہوئے کہا: "جی ہاں...... بہت سی باتیں...... لیکن یہ بتائیے کہ آپ اس وقت مسٹر میسن ہی ہیں نا؟"

"ہاہاہا...... اچھا سوال ہے...... ہاہاہا"۔ مسٹر میسن قہقہہ لگا کر مسکر بولے۔ "برخوردار! اس وقت تو میں جون میسن ہوں لیکن کون جانتا ہے کہ اگلے لمحے کیا ہوں گا؟ البتہ ایک بات تمہیں بتا دوں۔ تمہیں ڈرنے یا گھبرانے کی ضرورت نہیں۔ میرا جو بھی روپ ہو گا اچھا ہی ہو گا۔ انسان کی بھلائی کے لیے ہو گا۔ فوجی کا روپ ایسے فوجی کا ہو گا جو وطن کی سرحدوں کی حفاظت کرتا ہے۔ لوگوں کی مدد کرتا ہے۔ روبوٹ کا روپ ایسے روبوٹ کا ہو گا جو سب کی خدمت کرتا ہے اور اگر اپنے اصلی روپ میں رہا تو میرا مشن یہ ہو گا کہ علم کی جو روشنی میں نے حاصل کی ہے اسے دوسروں تک پہنچاؤں۔ دوسروں کے ذہنوں کو بھی روشن کرو"۔

حمزہ اپنی جگہ سے اٹھا اور مسٹر میسن کی کرسی کے قریب جا بیٹھا۔ میسن نے بڑے پیار سے اس کے سر پر ہاتھ پھیرا اور اس سے پہلے کہ حمزہ ان سے کوئی سوال کرتا انہوں نے بولنا شروع کیا:

"ڈاکٹر کوہی نے مجھے بتایا ہے کہ تمہارے دماغ میں کئی سوال ہیں۔ میں تم سے جو باتیں کروں گا ان میں تمہیں اپنے سارے سوالوں کے جواب مل جائیں گے۔ ڈاکٹر کوہی میرے بڑے ہمدرد ہیں لہٰذا میں نے یہ کہانی یعنی اپنی کہانی انہیں خود سنائی تھی۔ میں تمہیں یہ بھی بتا دوں کہ میں جب اپنا روپ بدلتا ہوں اور پھر اپنے اصلی روپ میں واپس آتا ہوں تو مجھے سب تو نہیں کچھ کچھ یاد رہ جاتا ہے۔ یہ بات ٹھیک ہے کہ میرے خاندان والوں پر جو ظلم ہوئے ان کی وجہ سے انسانوں پر میرا بھروسہ ختم ہو گیا۔ ہو سکتا ہے میں اسی لیے روبوٹ کا روپ اختیار کر لیتا ہوں۔ میں یہاں آنے کے بعد ایک دوبار اپنے وطن گیا لیکن باپ کے بارے میں کوئی خبر نہیں ملی۔ بہن بھائی سے میری ملاقات ہوئی۔ میں جتنے پیسے بھی یہاں بچا سکتا تھا وہ میں ان کی تعلیم کے لیے بھیج دیتا تھا۔ مجھے یقین تھا کہ میرا باپ اگر ہوتا تو ان کی تعلیم کے لیے ہر ممکن کوشش کرتا۔ میں بہت خوش ہوں کہ میری کوشش بے کار نہیں گئی اور میرے بھائی بہن تعلیم حاصل کر لینے کے بعد ایک اچھی زندگی گزار رہے ہیں۔ میں نے آزادی حاصل کرنے کے سلسلے میں اپنے وطن کی کیا خدمت کی اس بارے میں کچھ کہنا میں مناسب نہیں سمجھتا۔ بہرحال اتنا جان لو کہ آزادی سے پہلے اور آزادی کے بعد میں وطن کی خدمت سے غافل نہیں رہا اور وطن سے باہر رہ کر بھی جو خدمت ہو سکتی تھی وہ میں نے کی۔ میں اب ہر طرح سے خوش ہوں لیکن ہاں ایک غم ہے اور وہ یہ کہ میرے ماں باپ نے کوئی خوشی نہ دیکھی اور وہ مجھ سے بہت جلدی بچھڑ گئے"۔

یہ کہہ کر مسٹر میسن بالکل خاموش بیٹھ گئے۔ ان کی سانس تیز تیز چل رہی تھی اور وہ بہت بے چین لگ رہے تھے۔ حمزہ نے ان کی طرف دیکھا تو اسے یوں لگا جیسے مسٹر میسن ایک چھوٹا بچہ ہیں جو اپنے ماں باپ سے بچھڑ کر اداس اور بے چین ہے۔ وہ سوچنے لگا یہ مسٹر میسن کا کوئی نیا روپ تو نہیں؟ اس نے پھر غور سے مسٹر میسن کو دیکھا اور اس بار وہ اسے اور بھی معصوم نظر آئے۔ ایک ڈرا سہا بن ماں باپ کا بچہ...... اور پھر اچانک اسے اپنے ماں باپ یاد آگئے۔ وہ ان کے بارے میں سوچ ہی رہا تھا کہ شہلا کی آواز نے اسے چونکا دیا۔ شہلا کا ہاتھ مسٹر میسن کی نبض پر تھا اور وہ گھبرا کر کہہ رہی تھی:

"مسٹر میسن آنکھیں کھولیں! وہ منہ سے کچھ نہ بولے لیکن اپنا داہنا ہاتھ انہوں نے سینے کے بیچ میں رکھ دیا۔ شہلا نے جلدی سے اپنے بیگ سے ایک لال رنگ کی شیشی نکالی اور مسٹر میسن کا منہ

کھول کر زبان کے نیچے اسپرے کیا۔ پھر وہ جیب سے موبائیل فون نکال کر ایمرجنسی کا نمبر ملانے ہی والی تھی کہ اسے ایمبولنس کے سائرن کی آواز سنائی دی۔ چند ہی لمحوں میں دو آدمی وہیل چیئر لیے شہلا کے کمرے کی طرف آئے۔ انہوں نے جلدی سے مسٹر میسن کے ایک ٹیکہ لگایا اور انہیں وہیل چیئر پر بٹھا کر ایمبولنس کی طرف لے چلے۔

یہ سارا واقعہ ایسا آناً فاناً ہوا کہ حمزہ حیران رہ گیا۔ وہ سوچنے لگا کہ ایکا ایکی مسٹر میسن کو کیا ہو گیا؟ ان کی طبیعت خراب ہونے کی اطلاع ایمبولنس اور ہسپتال والوں کو کس نے دی؟ اور وہ ان کی طبیعت خراب ہونے کے چند ہی منٹ کے اندر ہوسٹل کیسے پہنچ گئے؟ وہ دیر تک ان سوالوں کے جواب تلاش کرتا رہا لیکن اس کی سمجھ میں کچھ نہ آیا۔ اس کی ساری بقراطی سوچ آج دھری کی دھری رہ گئی۔ اس نے شہلا سے پوچھا تو وہ بھی کچھ نہ بتا سکی۔ وہ تو خود حیران تھی کہ یہ ماجرا کیا ہے؟

شہلا تھوڑی دیر بعد ہسپتال کی ایمرجنسی سے مسٹر میسن کی خیریت دریافت کر رہی تھی۔ لیکن حمزہ اپنے خیالوں میں کھویا ہوا تھا۔ وہ سوچنے لگا کہ مسٹر میسن کتنے بڑے انسان ہیں۔ کتنی ہمت والے ہیں۔ وہ زندگی بھر برے حالات سے لڑتے رہے اور آخر اپنا مشن پورا کیا۔ اپنے باپ کی سب سے بڑی خواہش پوری کی۔ خود علم حاصل کیا اور بھائی بہن کو تعلیم دلوائی اور پھر اچانک اس کی نظروں کے سامنے اپنی ماں کا چہرہ آگیا جو اس کا ریزلٹ آنے پر ہمیشہ کہتی تھی "ایکسی لنٹ! شاباش میرے بیٹے۔ جیتے رہو اور ترقی کا زینہ اسی طرح طے کرتے رہو"۔ حمزہ دیر تک اپنے خیالوں میں ماں کا مسکراتا چہرہ دیکھتا رہا...... اور پھر اسے یوں محسوس ہوا جیسے ماں اس کے بالوں میں پیار سے ہاتھ پھیر رہی ہے۔ اس نے چونک کر اوپر دیکھا۔ یہ شہلا کا ہاتھ تھا۔ اسے محسوس ہوا کہ اس ہاتھ کی سختی نرمی میں بدل گئی تھی۔ شہلا نے بڑے دھیمے لہجے میں کہا: "حمزہ! ہسپتال سے کچھ اچھی خبریں نہیں مل رہیں۔ میں نے ڈاکٹر کو ہی کو بھی بتا دیا ہے۔ وہ ہسپتال جا رہے ہیں۔ چلو ہم بھی چلیں"۔ حمزہ نے گھبرا کر کہا "کیا خبر ملی ہے؟ بتائیے تو کچھ تو بتائیے"۔ شہلا نے صرف اتنا کہا "حوصلہ رکھو" اور پھر دونوں ہسپتال روانہ ہو گئے۔

(باقی آئندہ ماہ)

وکیل چور سے: "اب جب کہ میں نے تمہیں بری کروادیا ہے مجھے یہ تو بتاتے جاؤ کہ تم نے چوری کی تھی یا نہیں؟
چور: عدالت میں آپ کی بحث سن سن کر مجھے یقین سا ہو گیا ہے کہ میں نے چوری نہیں کی؟
(سعدیہ شاد' لاہور)

ایک آدمی شربت والے کے پاس گیا اور کہنے لگا۔ جلدی سے ایک گلاس شربت دینا میری لڑائی ہونے والی ہے۔ وہ ایک گلاس پی کر بولا۔ جلدی سے ایک گلاس اور دینا میری لڑائی ہونے والی ہے۔
پھر دوسرا گلاس پی کر بولا: ایک گلاس اور دینا۔ تیسرے کے بعد چوتھا گلاس مانگا تو دوکاندار نے پوچھا: آخر آپ سے کس کی لڑائی ہونے والی ہے؟ وہ بولا: آپ کے ساتھ کیونکہ میرے پاس شربت کے پیسے نہیں ہیں۔
(ایاز نعیم ایازی' شمہ ہاری)

ایک پاگل (دوسرے پاگل سے): تم نے کتنی تعلیم حاصل کی ہے؟
دوسرا پاگل: میں نے ایم۔ اے کیا ہے۔ اب سوچ رہا ہوں کہ میٹرک بھی کرلوں۔ (محمد زبیر شوری فاضل پور)

ماں (بیٹی سے): مجھے پانی پلاؤ میں مری جا رہی ہوں۔
بیٹی: امی' میں بھی آپ کے ساتھ مری جاؤں گی۔
(حنا سعید' سیالکوٹ)

ایک مسخرے سے کسی نے پوچھا کہ تمہارا رنگ کالا کیوں ہے تو اس نے فوراً شعر میں جواب دیا۔
رنگ ہے میرا کالا فرشتوں کی بھول سے
اک تل بنا رہے تھے کہ سیاہی اُلٹ گئی
(کنزہ عبدالخالق' منڈی بہاؤالدین)

کلاس روم میں ایک استاد نے اپنے شاگردوں سے پوچھا کہ جنت میں کون جانا چاہتا ہے؟
سب نے ہاتھ کھڑا کیا مگر ایک لڑکا چپ چاپ بیٹھا رہا اور ہاتھ کھڑا نہیں کیا۔ جب استاد نے اس سے پوچھا کہ جناب آپ جنت میں کیوں نہیں جانا چاہتے تو اس نے کہا کہ مجھے امی جان نے کہا تھا کہ اسکول سے سیدھے گھر آنا۔
(نوید احمد' شکارپور)

ننھا سفیان صبح کی نماز کے بعد بہت گڑگڑا کر دعا مانگ رہا تھا۔ یا اللہ جہلم کو پاکستان کا دارالخلافہ بنادے۔
ماں۔ بیٹا تم ایسے دعا کیوں مانگ رہے ہو۔
بیٹا۔ میں پرچے میں یہی لکھ آیا ہوں۔
(محمد رضوان' منڈی بہاؤالدین)

ایک مریض ڈاکٹر صاحب کی خدمت میں اس حالت میں حاضر ہوا ہے کہ اس کے دونوں کان بری طرح جلے ہوئے تھے۔
یہ کیسے ہوا؟ ڈاکٹر نے پوچھا۔
مریض بتانے لگا: ڈاکٹر صاحب! میں کپڑے استری کر رہا تھا کہ فون کی گھنٹی بج اٹھی۔ میں نے استری کو فون سمجھ کر کان سے لگالیا۔
لیکن تمہارے تو دونوں کان جلے ہوئے ہیں؟
وہ دراصل ابھی استری میں نے رکھی ہی تھی کہ فون کی گھنٹی دوبارہ بج اٹھی۔ اس نے معصومیت سے جواب دیا۔
(اظہر وقار' بہاولنگر)

مجرم کون؟

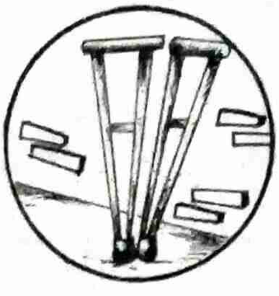

مجرم کا کھوج لگائیں اور 500 روپے
کی کتابوں کا انعام پائیں۔

ہر حل کے ساتھ کوپن بھیجنا ضروری ہے۔ جواب بھیجنے کی آخری تاریخ 10 جون 2003ء

مجرم کون؟

نام: ____________

پورا پتا: ____________

____

____

ایک قاتل کافی دنوں سے پکڑا نہیں جا رہا تھا۔ انسپکٹر زاہد کو جس آدمی پر شک تھا اس نے ٹانگوں سے معذور ہونے کا ڈھونگ رچا رکھا تھا۔ ایک روز انسپکٹر زاہد نے اُسے اپنے ہاں بلایا۔ جب وہ انسپکٹر زاہد کے گھر پہنچا تو وہ باتھ روم میں تھے۔ دروازے کی گھنٹی بار بار بج رہی تھی۔ آخر کچھ دیر بعد انہوں نے دروازہ کھولا تو باہر وہیل چیئر پر وہی معذور آدمی تھا۔ اُسے دیکھتے ہی انسپکٹر کا شک یقین میں بدل گیا کہ یہی اصل مجرم ہے اور یہ بچنے کے لیے معذوری کا محض ڈرامہ رچا رہا ہے۔ انسپکٹر زاہد نے یہ اندازہ کیسے لگایا؟ کیا آپ بتا سکتے ہیں!

مئی 2003ء میں شائع ہونے والے "مجرم کون؟" کا صحیح حل: انسپکٹر زاہد نے فوٹو گرافر کی کھینچی ہوئی تصویر اور پکڑے جانے والے شخص کا جائزہ لیا تو شکل کی مشابہت ہونے کے باوجود انہیں ایک واضح فرق نظر آیا۔ تصویر میں ڈاکو کے چہرے پر تل موجود تھا جب کہ اس شخص کی شکل تو ڈاکو سے ملتی تھی لیکن اس کے چہرے پر تل نہیں تھا۔ وہ ڈاکو کا ہم شکل تھا مگر اصل ڈاکو نہیں تھا۔ لہٰذا انسپکٹر زاہد نے اُسے رہا کر دیا۔

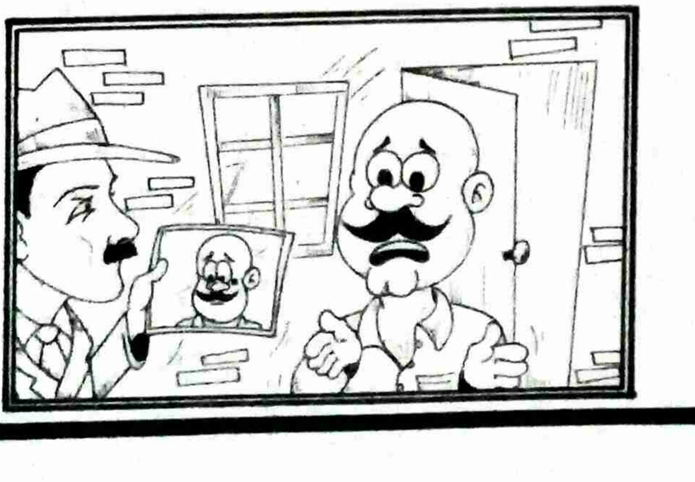

یہ جواب اس دفعہ ہزاروں بچوں نے ارسال کیا' جن میں سے 10 بچے بذریعہ قرعہ اندازی انعام کے حق دار ٹھہرے۔ ان ساتھیوں کو 50' 50 روپے کی کتابیں دی جا رہی ہیں۔

(1) عثمان باسط' کھاریاں (2) فریال علی' پشاور (3) زلیخہ کامدار' کراچی (4) زینب خورشید' راولپنڈی (5) محمد اسامہ' پاک پتن (6) محمد آصف منیر' شورکوٹ (7) امروز اسلم' لاہور (8) محمد جاوید ناز' حاصل پور (9) مہک اسرار' لاہور (10) وسیم عباس' ڈیرہ اسماعیل خان۔

"تعلیم و تربیت" کے ہونہار قارئین کے نام!

جناب امجد اسلام امجد۔ تمغہ حسن کارکردگی، تمغہ امتیاز
پروجیکٹ ڈائریکٹر: چلڈرنز لائبریری کمپلیکس، لاہور

"میں سمجھتا ہوں کہ بچے ہمارے معاشرے کا ایسا حصہ ہیں جسے اب تک نظر انداز کیا گیا ہے۔ اگرچہ بچوں کے لیے بہت سے میگزین شائع ہو رہے ہیں مگر کم پرچے ایسے ہیں جنہیں ہم بچوں کے حوالے سے معیاری پرچے کہہ سکتے ہیں۔ "تعلیم و تربیت" نے بچوں کے لیے بڑا کام کیا ہے۔ یہ سالہاسال سے نئی نسل کی بہتر خدمت سرانجام دے رہا ہے۔ آج کے بچے کا ذہنی معیار اور اس کی Fantacy بدل گئی ہے۔ پرانے وقتوں میں جنوں بھوتوں اور پریوں شہزادوں کی کہانیاں سنی جاتی تھیں، اب الیکٹرانک میڈیا کا دور ہے۔ نظریات بدل گئے ہیں۔ میرا خیال ہے کہ بچوں کی دلچسپی کے عناصر بجائے ماضی کے اب مستقبل میں تلاش کرنے چاہئیں۔ بچوں کے لٹریچر میں اخلاقی اقدار کا بھی ضرور خیال رکھنا چاہیے۔

ہمیں بچوں کو یہ بتانے کی کوشش کرنی چاہیے کہ جو لوگ زندگی میں کامیابی کی اعلیٰ منزلوں تک پہنچے ہیں ان کی کوشش و جدوجہد کے مختلف مراحل سے وہ بخوبی آشنا ہوں۔ ہماری خوش قسمتی تھی کہ ہم انگلش میڈیم جیسے اسکولوں سے محفوظ رہے۔ یہ تو ایک چتکبرا سا ایجوکیشن سسٹم ہے۔ ہمارے بچپن میں اسکولوں میں بڑا دلچسپ مگر سادہ اور صاف ستھرا نصاب پڑھایا جاتا تھا۔ جہاں تک شرارتوں کا تعلق ہے، میں تو یہی کہوں گا کہ شرارتیں سب بچے کرتے ہیں بلکہ جو بچہ شرارت نہ کرے اس کی صحت کے بارے میں فکر مند ہونا چاہیے۔ تاہم ہر چیز کے لیے ایک حد ہوتی ہے۔ بچوں کو ایسی شرارتوں سے باز رہنا چاہیے جو دوسروں کے لیے تکلیف کا باعث بنیں۔ ہم نے جو اپنا بچپن گزارا، اسی طرح گزارا۔ چھوٹے موٹے کھیل بھی کھیلے۔ میں سمجھتا ہوں کہ بچے اپنے فالتو وقت کو ایسی تفریح میں گزاریں جو ان کی صحت کے لیے فائدہ مند ہو۔ ابھی تک یاد ہے کہ بچپن میں مجھے کہانیاں سننے کا بڑا شوق تھا۔ میری ایک خالہ جو نابینا تھیں، مجھے بڑی اچھی اچھی کہانیاں سنایا کرتی تھیں۔ انہی کہانیوں کو تھوڑا بہت ادل بدل کر کے میں اسکول کی بزمِ ادب میں سنایا کرتا تھا۔ اسی سے کہانی سنانے کی صلاحیت پیدا ہوئی۔ اب میں اپنے ڈراموں کی صورت میں بڑوں کو کہانیاں سناتا ہوں۔

بچوں کو چاہیے کہ وہ اپنے بڑوں سے اکتساب کریں، ان سے سیکھیں تاکہ ان کے اندر جو صلاحیتیں ہیں ان کی واضح شکل بنے۔ اس اعتبار سے ہمارا بچپن کچھ زیادہ خوش نصیب تھا کہ ہمارے والدین ہمیں خود بتایا کرتے تھے کہ ایسے بچوں سے دوستی کرو جو اخلاق میں اچھے ہیں یا یہ کہ جو بچے اخلاق میں اچھے نہیں ہیں ان سے ہمیں دور رہنا چاہیے۔ آج کل کے بچے کے سامنے اتنی چکا چوند کر دینے والی روشنی ہے، اتنی غیر مانوس چیزیں اس کے اردگرد پھیلی ہوئی ہیں کہ ان میں اُسے اپنا پن، اپنی قدریں یا اپنی ثقافت نظر ہی نہیں آتی۔ ہمیں اپنے بچوں کو اپنی اخلاقی قدروں اور ثقافت کے بارے میں ضرور آگاہ کرنا چاہیئے۔

بچوں کے لیے میرا پیغام یہی ہے کہ زندگی میں سچائی اور دیانتداری کے ساتھ ساتھ ایک یہ بھی اُصول بنالیں کہ جو بھی راستہ وہ اختیار کریں اور جو بھی منزل اپنے لیے متعین کریں، ہمیشہ اس منزل کے سامنے والے دروازے سے داخل ہوں۔ جو بھی منزل سامنے ہو، اس کے حصول کے لیے یہی بات ذہن میں رکھیں چاہے کتنی ہی دیر کیوں نہ ہو جائے"۔

ممتاز ادیب اور محقق۔ نہایت دلچسپ اور معلوماتی کہانیاں لکھتے ہیں۔ گزشتہ سال سے "تعلیم و تربیت" کے ہونہار قارئین کے لیے خوب مزے مزے کی مہماتی کہانیاں لکھ رہے ہیں۔ شکاریات اور مہم جوئی ان کا خاص شعبہ ہے۔

جنید احمد

خونی دریا

دریائے ایمزن دنیا کا دوسرا بڑا دریا ہے (پہلے نمبر پر دریائے نیل ہے) اس کی لمبائی 6400 کلو میٹر ہے۔ لیکن اگر پانی کی مقدار کے حساب سے دیکھا جائے تو یہ دنیا کا سب سے بڑا دریا کہلائے گا۔ یہ دریا براعظم جنوبی امریکا کے تین بڑے ملکوں برازیل، بولیویا اور پیرو سے گزرتا ہوا سمندر میں جا گرتا ہے۔ اس کی کئی شاخیں ہیں۔ برازیل میں دریائے ایمزن دنیا کے سب سے بڑے اور خطرناک جنگلات سے گزرتا ہے۔ یہ جنگلات ایمزن کے جنگلات کہلاتے ہیں۔ دنیا کے ایسے یہاں جانور کہاں موجود ہیں جو کہیں اور نہیں پائے جاتے۔ مثلاً عجیب و غریب بندر، بڑے بڑے طوطے (میکاؤ) شیر کی ایک خطرناک قسم جیگوار، گوشت خور چیونٹیاں اور دریا کے کناروں پر بڑے بڑے مگرمچھ اور شارک سے زیادہ خطرناک مچھلی "پیرانیا" اس دریا میں ملتی ہے۔ یہ مچھلی غول کی صورت میں رہتی ہے اور منٹوں میں اپنے شکار کو ہڑپ کر جاتی ہے۔ یہاں دریا کے ساتھ ساتھ پائی جانے والی بڑی بڑی دلدلیں ہیں اور ان دلدلوں میں دنیا کا سب سے بڑا اژدہا اینا کونڈا رہتا ہے۔ اس کی لمبائی چالیس فٹ تک پہنچ جاتی ہے۔ چوڑائی ڈیڑھ سے دو فٹ تک ہوتی ہے۔ یہ اپنے شکار کو بھینچ کر ہلاک کر دیتا ہے اور پھر سالم نگل جاتا ہے۔ اس کی مرغوب غذا بندر اور پرندے ہیں۔ اگر اسے چھیڑا نہ جائے تو یہ بالکل بے ضرر ہے۔ یہ دریا اور اُس کے جنگلات ان گنت انسانوں کو نگل چکے ہیں۔ پیارے بچو! اب ہم اصل واقعہ کی طرف آتے ہیں:۔

1940ء کا ذکر ہے۔ پورا یورپ دوسری جنگ عظیم کی لپیٹ میں تھا۔ تین مہم جو دوست وکٹر، ٹریور اور کرٹس جنگ سے بھاگ کر برازیل آگئے۔ اصل میں یہ سونے اور ہیروں کے چکر میں یہاں آئے تھے مگر یہاں آکر انہیں پتا چلا کہ دریا کے ساتھ جنگلات میں آباد جنگلی قبائل یورپین لوگوں کے سخت دشمن ہو چکے ہیں کیونکہ اس وقت تک پرتگالی اور ہسپانوی یہاں سے تقریباً سب کچھ لوٹ کر لے جا چکے تھے۔ یہ تینوں دوست بے مقصد شہر شہر

پھرتے رہے۔ ایک روز ان کی ملاقات گوفر نامی ایک ریڈ انڈین سے ہوئی۔ پڑھا لکھا ہونے کی وجہ سے یہ انگریزی اور پرتگالی بڑی اچھی بول سکتا تھا۔ جلد ہی یہ بھی ان کا دوست بن گیا۔ باتوں باتوں میں اس نے بتایا کہ اسے جنگل میں ایسی جگہ کا پتا ہے جہاں بہترین لکڑی پائی جاتی ہے۔ اس نے مزید بتایا کہ اس لکڑی کی ہمسایہ ممالک میں بہت مانگ ہے اور اگر یہ یورپ تک لے جائیں تو پھر کیا ہی بات ہے۔ ان تینوں نے اس بات میں بڑی دلچسپی ظاہر کی۔ گوفر نے کہا ”لکڑی جس قبیلے کے پاس ہے وہاں کا سردار بڑا لالچی ہے۔ اگر آپ اسے تحفے تحائف دیں تو شاید وہ لکڑی کاٹنے کی اجازت دے دے رہا زبان کا مسئلہ تو میں اکثر قبائل کی بولیوں اور رسم و رواج سے واقف ہوں۔ بس ہمیں ایک بڑی سی لانچ اور مناسب اسلحہ چاہیے۔

چنانچہ انہوں نے فوراً تیاری شروع کر دی۔ خاصی تگ و دو کے بعد یہ ایک کباڑیے سے ایک اچھی سی لانچ خریدنے میں کامیاب ہو گئے۔ اسلحہ ملنا یہاں کچھ مشکل نہ تھا لہٰذا چار بہترین رائفلیں بڑی مقدار میں کارتوس' دو عدد بیٹری سے چلنے والی کلہاڑیاں (آریاں) خریدی گئیں۔ یورپین ہونے کی وجہ سے حکام نے ان پر زیادہ توجہ نہ دی۔ ویسے بھی ایسی پارٹیاں یہاں آتی رہتی تھیں۔ اب یہ بالکل تیار تھے۔ جس قصبے سے انہیں لانچ ملی تھی وہیں سے یہ روانہ ہوئے۔ لانچ 30 فٹ لمبی اور دس فٹ چوڑی تھی۔ اس میں ایک تہہ خانہ بھی تھا۔ ایندھن ان کے پاس وافر مقدار میں تھا اور یہ باآسانی بولیویا یا اس سے آگے جا سکتے تھے۔ گوفر نے انہیں مختصر راستے سے لے جانا تھا۔ صبح صبح جب کہ موسم خاصا خوشگوار تھا یہ روانہ ہو گئے۔ دوپہر ہوتے ہوتے یہ جنگل میں داخل ہو چکے تھے۔ اب دریا کا پاٹ خاصا تنگ ہو چکا تھا۔ دونوں طرف گھنا جنگل تھا۔ چاروں طرف عجیب سی بو پھیلی ہوئی تھی۔ درختوں پر بندروں نے انہیں دیکھ کر چیخ چیخ کر آسمان سر پر اٹھا رکھا تھا۔ بڑے بڑے طوطے بھی انہیں گھور رہے تھے۔ اچانک ڈھول بجنے کی آواز گونجنے لگی۔ انہوں نے گوفر سے پوچھا تو اس نے انہیں بتایا کہ جنگلی قبائل ایک دوسرے کو ان کی آمد سے آگاہ کر رہے ہیں۔ میری آپ سے درخواست ہے کہ اگر کوئی آپ کو روکے تو رک جائیں اور بغیر سوچے سمجھے فائر نہ کریں ورنہ زہر سے بجھے تیروں سے بچنا ناممکن ہے۔ تقریباً شام ہو چلی تھی۔ اب ان کی لانچ ایک موڑ مڑ رہی تھی کہ اچانک انہیں ایک کشتی نظر آئی جس میں چار نوجوان بیٹھے ہوئے تھے۔ ان سب نے تیر کمان چڑھا رکھے تھے۔ لانچ کرٹس چلا رہا تھا۔ گوفر کے کہنے پر اس نے لانچ روک دی۔ کشتی اب ان کی لانچ کے ساتھ آ لگی۔ گوفر نے ان کے سردار سے عجیب سی بولی میں کچھ کہا۔ اس نے انہیں اپنے ساتھ آنے کا اشارہ کیا۔ وہ لانچ کشتی کے پیچھے لے گئے اور کنارے سے لگا دی۔ پھر وہ انہیں گھیرے میں لے کر جنگل میں داخل ہو گئے۔ گوفر نے انہیں بتایا کہ یہی وہ جگہ ہے جہاں سے انہوں نے لکڑی کاٹنی ہے۔ نوجوان انہیں ایک عجیب سے گاؤں میں لے گئے۔ کچھ دیر بعد انہیں سردار کے سامنے پیش کیا گیا۔ گوفر نے اسی بولی میں ان کے آنے کا مقصد بیان کیا اور اس کے کہنے پر ان تینوں نے سردار کو تحفے پیش کیے۔ مثلاً پن' کچھ کھلونے گھڑیاں' ہیٹ اور چھتری وغیرہ۔ سردار اور ان قبائلیوں کے لیے یہ چیزیں حیران کن تھیں۔ سردار فوراً ان کا گرویدہ ہو گیا۔ رات انہیں اس گاؤں میں ٹھہرنا پڑا۔ رات تو یہ مچھروں سے جنگ کرتے رہے۔ گاؤں والوں نے مچھروں اور دوسروں جانوروں کے لیے بڑا سا الاؤ جلا رکھا تھا۔ لیکن پھر بھی مچھر انہیں کاٹتے رہے۔ آخر خدا خدا کر کے صبح ہوئی۔ سردار کی اجازت سے یہ کچھ نوجوانوں کے ساتھ پہلے اپنی لانچ میں گئے وہاں سے آریاں لیں اور پھر جنگل میں اس جگہ گئے جہاں سرخ لکڑی کے درخت تھے۔ لانچ کی گنجائش کے مطابق انہوں نے لکڑی کاٹی اور اسے لانچ کے تہہ خانے میں پہنچا دیا۔ سردار سے اجازت لی اور روانہ ہو گئے۔

اب آگے دریا کے دو راستے تھے۔ گوفر نے کرٹس سے کہا کہ وہ دائیں والے راستے پر چلیں۔ اس راستے سے ہم جلد بولیویا میں داخل ہو جائیں گے۔ لانچ اب انتہائی گہرے جنگل سے گزر رہی تھی۔ سورج کی کرنیں ان تک بمشکل پہنچ رہی تھیں۔ یہ سارا علاقہ دلدلی تھا۔ دوپہر کے وقت کشتی کے پچھلے حصے میں وکٹر بندوق لیے کھڑا تھا کہ اس نے کنارے پر جو زیادہ دور نہیں تھا ایک درخت کے تنے کے ساتھ بہت بڑا سانپ لپٹا ہوا دیکھا۔ یہ کم از

کم 40 فٹ لمبا تھا اور درخت سے چمٹا ہوا تھا۔ یقیناً یہ آرام کر رہا تھا۔ وکٹر نے کچھ سوچے بغیر اس پر فائر کر دیا۔ چھرے سانپ کی دم کے اوپر لگے۔ یہ شوں کی آواز سے جاگا اور اپنی لال انگارا آنکھوں سے گھورتا ہوا دلدل میں غائب ہو گیا۔ فائر سن کر تینوں بھاگتے ہوئے وکٹر کے پاس آئے۔ جب وکٹر نے انہیں سانپ کے بارے میں بتایا تو گوفر کا رنگ اڑ گیا۔ "یہ ایناکونڈا ہو گا یہ ہمارے پیچھے ضرور آئے گا۔ اب ہمیں ہوشیار رہنا ہو گا"۔ "تم فکر نہ کرو اس دفعہ یہ بچ کر نہیں جائے گا"۔ وکٹر نے بندوق لہراتے ہوئے کہا۔ "نہیں صاحب آپ نہیں جانتے ایناکونڈا بڑا کینہ پرور ہے یہ ضرور ہم پر حملہ کرے گا۔ ہمیں اب بہت ہوشیار رہنا ہو گا"۔ گوفر کی اس بات کو تینوں نے زیادہ سنجیدگی سے نہیں سنا اور کھانے میں مشغول ہو گئے۔ خوراک بھی ان کے پاس وافر مقدار میں تھی۔ اب دریا بتدریج تنگ ہوتا جا رہا تھا۔ یہاں تک کہ ان کی لانچ کنارے کے ساتھ ساتھ چلنے لگی اور انہیں اپنی رفتار بھی بہت کم کرنی پڑی۔

یہاں جنگل میں ہو کا عالم تھا۔ نہ تو یہاں بندر تھے اور نہ ہی پرندے۔ ہر طرف عجیب سی بو پھیلی ہوئی تھی۔ جلد ہی شام کے سائے پھیلنے لگے۔ یہ جلد از جلد اس جنگل سے نکلنا چاہتے تھے۔ اس لیے یہ فیصلہ کیا گیا کہ سفر رات کو بھی جاری رکھا جائے۔ لانچ کے کیبن کی چھت پر ایک طاقتور لائٹ روشن تھی اور ان کا سفر برابر جاری تھا۔ رات کا کھانا کھا کر کرٹس نے وکٹر سے کہا کہ وہ لانچ کے پچھلے حصے میں پہرہ دے۔ اول تو مسئلہ کوئی نہیں ہے تاہم احتیاطاً تمہیں اپنی بندوق تیار رکھنی چاہیے۔ باقی تینوں آگے کیبن میں چلے گئے۔

رات خاموش تھی اور آسمان پر ستارے چمک رہے تھے۔ وکٹر بندوق لیے عرشے پر بیٹھا تھا۔ اچانک اس کی نظر لانچ کے کنارے پر پڑی۔ اسے یوں لگا جیسا کہ اس نے وہاں دو سرخ نقطے سے دیکھے ہیں۔ "یہ کیا ہو سکتا ہے؟" یہ سوچ کر وکٹر بالکل تیار ہو کر کنارے کی طرف بڑھا۔ وہاں کچھ بھی نہیں تھا۔ کنارہ پانی کی سطح سے تقریباً تین فٹ اونچا تھا۔ اس نے کنارے کے اوپر پہنچ کر نیچے دریا میں دیکھا۔ پانی بالکل پر سکون انداز میں بہہ رہا تھا۔ صرف لانچ کی آواز سنائی دے رہی تھی۔ اس نے ٹارچ روشن کی اور نیچے پانی میں روشنی ڈالی۔ اسے کچھ نظر نہیں آیا۔ اس سے پہلے کہ وہ پیچھے ہٹتا۔ پانی میں سے ایناکونڈا کا ہتھوڑا نما سر بجلی کی سی تیزی سے نکلا اور اس کے منہ سے ٹکرایا۔ حملہ اتنا شدید تھا کہ یہ اُلٹ کر دریا میں جا گرا۔ بس ایک زور دار بھیانک چیخ ماری اور بس۔ یہ چیخ سن کر دوسرے تینوں افراد پاگلوں کی طرح کیبن سے باہر آئے اور اسے پکارنا شروع کر دیا مگر وہ وہاں ہوتا تو ملتا۔ لانچ میں دیکھا۔ تہہ خانے میں گئے۔ اب یہ ایک دوسرے کی طرف دہشت زدہ ہو کر دیکھ رہے تھے۔ "یہ یقیناً ایناکونڈا ہے"۔ گوفر نے خاموشی توڑی۔ "بکواس بند کرو۔ ایناکونڈا کوئی جن نہیں ہے۔ میرا خیال ہے کہ وکٹر پانی میں گر گیا ہے"۔ ٹریور نے کہا۔ "وکٹر بہترین تیراک ہے۔ یہ ناممکن ہے کہ وہ ڈوب جائے"۔

یہ تینوں ساری رات جاگتے رہے اور سفر جاری رہا۔ نیند ان کی اُڑ چکی تھی۔ صبح دریا کا پاٹ پھر چوڑا ہو گیا اور انہوں نے رفتار بڑھا دی۔ اپنے ساتھی کی موت کا انہیں افسوس تھا۔ دن بھر بالکل خاموش رہے۔ شام کے وقت بادل چھا گئے اور رات ہوتے ہوتے بوندا باندی شروع ہو گئی۔ "آج رات گوفر، تم لانچ کے پچھلے حصے میں رہو۔ خطرہ محسوس کرو تو فوراً ہمیں آواز دو۔ بندوق تمہارے پاس ہے اسی سے کام لو"۔ کرٹس نے گوفر کو ہدایات دیں۔ ہلکی ہلکی بوندا باندی ہو رہی تھی۔ لانچ آہستہ آہستہ رواں دواں تھی۔ یہ دونوں

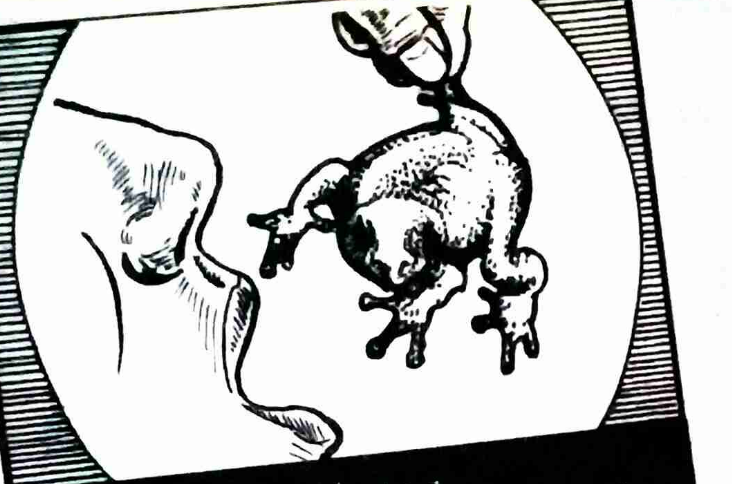

قدیم ٹوٹکا

پندرھویں سولھویں صدی میں بچوں کی کھانسی کے علاج کے لیے ایک زندہ مینڈک کو بچے کے منہ میں ڈال دیا جاتا تھا۔ اسی طرح ایک اور طریقہ علاج کے مطابق ایک بوڑھے مکڑے کو بچے کے سر پر لٹکا دیا جاتا تھا۔ اس دوران کچھ خاص الفاظ بھی بولے جاتے تھے۔

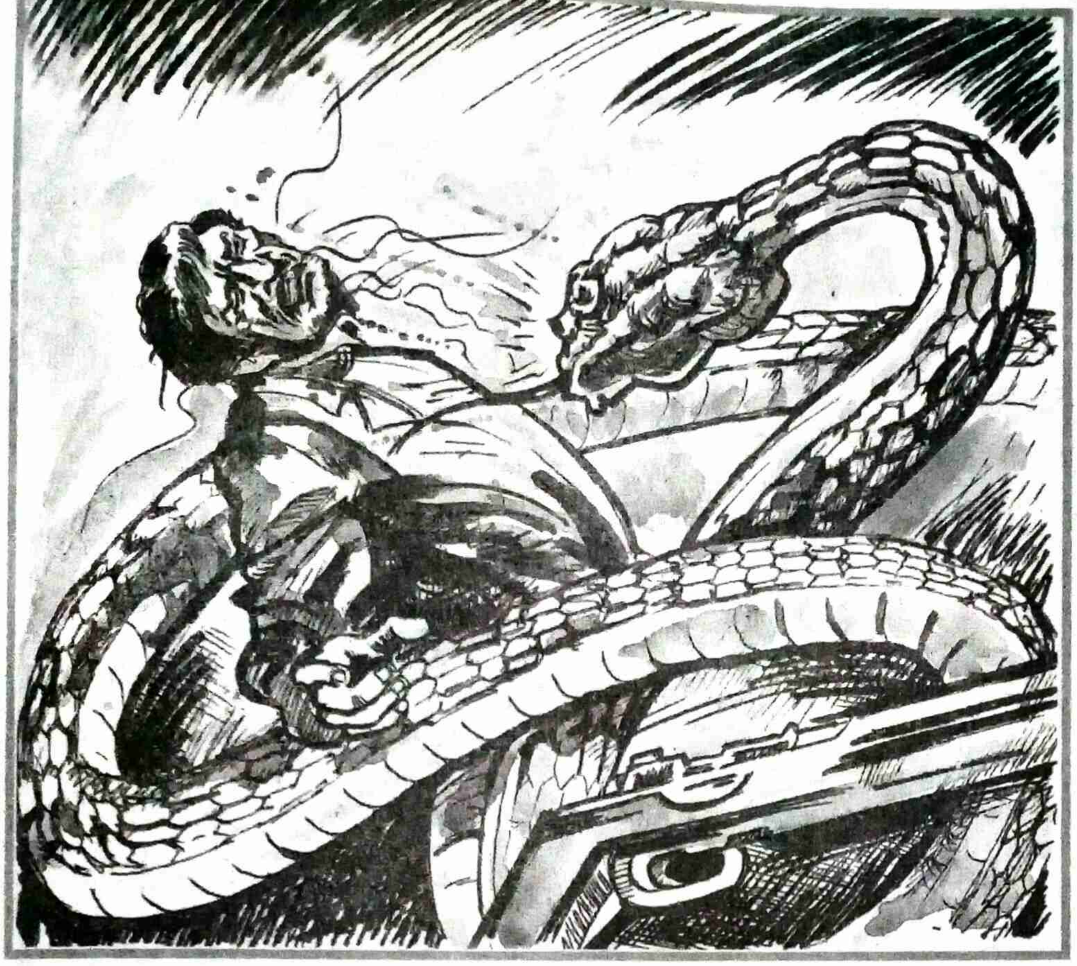

کیبن میں چلے گئے اور گوفر کیبن کی دیوار کے ساتھ شیڈ میں ٹیک لگا کر بیٹھ گیا۔ کیبن میں ٹریور نے سٹیئرنگ سنبھال رکھا تھا اور کرٹس سو رہا تھا۔ اب بارش بند ہو چکی تھی۔ گوفر پر نیند کا غلبہ طاری ہو رہا تھا۔ لہٰذا اس نے اٹھ کر چکر لگانا شروع کر دیا۔ اچانک اسے یوں لگا جیسے کوئی تہہ خانے میں ہے۔ کھڑ کھڑ کی آواز واضح تھی۔ یہ فوراً تہہ خانے کی طرف گیا اور نیچے روشنی پھینکی۔ اسے لکڑی اور پٹرول کے ڈبے نظر آئے مگر یہ آواز کیسی تھی۔ یہ نیچے اترا اور چاروں طرف دیکھنے لگا۔ آگے ہو کر اس نے لکڑیوں کے گٹھوں کے اندر جھانکا۔ اچانک اسے اپنے پیچھے کسی کی موجودگی کا احساس ہوا۔ یہ فوراً مڑا۔ مگر دیر ہو چکی تھی۔ اینا کونڈا کا وار اتنا شدید تھا کہ گوفر چیخ بھی نہ سکا۔

ادھر کیبن سے ٹریور بدستور لانچ چلا رہا تھا۔ اب دن کا اجالا پھیل رہا تھا۔ اس نے کرٹس کو بیدار کیا۔ انہیں چائے کی طلب ہو رہی تھی۔ "گوفر چائے بناؤ یار! کرٹس نے وہیں سے آواز لگائی۔ جواب نہ پا کر اس نے ٹریور کی طرف دیکھا۔ ٹریور نے لانچ کے انجن کو بند کیا اور دونوں کیبن سے باہر آئے۔ گوفر ہوتا تو انہیں نظر آتا۔ یہ اسے آوازیں دینے لگے۔ اب یہ جان چکے تھے کہ ان کا مقابلہ ایک بے حد خطرناک سانپ سے ہے جو انہیں ایک ایک کر کے کھا رہا ہے۔ یہ دونوں تہہ خانے میں ڈرتے ڈرتے داخل ہوئے۔ وہاں گوفر کی بندوق اور ٹارچ پڑی تھی۔ فرش پر کافی خون پھیلا ہوا تھا۔ اینا کونڈا اپنا دوسرا وار کر چکا تھا۔ "ہمیں اب جلد از جلد اس منحوس جگہ سے نکلنا چاہیے۔ میرا خیال ہے کہ جنگل میں چلے جائیں یہی ہمارے بچنے کا راستہ ہے"۔ ٹریور نے تقریباً چیختے ہوئے کہا۔ "تمہارا دماغ چل گیا ہے ہمارے چاروں طرف دلدلیں ہیں اور ہم اگر ان سے بچ بھی گئے تو کہاں جائیں گے۔ ہماری سلامتی یہاں سے اسی طرح سفر کرتے ہوئے ممکن ہے۔ اب جنگل پھر گھنا ہوتا جا رہا تھا اور ان کی رفتار پہلے سے کافی تیز تھی۔ گوفر کے بتائے ہوئے راستے پر ان کی لانچ چل رہی تھی۔ اس کے مطابق ابھی تقریباً 200 میل کا سفر باقی تھی۔ دوپہر کو جب کہ دھوپ بہت تیز تھی لانچ اچانک رک گئی۔ انجن بالکل بند ہو چکا تھا۔ "ٹریور" تم پچھلی جانب چلے جاؤ! میں نیچے جا کر انجن چیک کرتا ہوں"۔ کرٹس نے کہا اور کیبن کے نیچے چھوٹے سے تہہ خانے میں داخل ہو گیا۔ ٹریور کیبن سے باہر آ کر چاروں طرف چوکنا ہو کر دیکھنے لگا۔ کرٹس نے انجن کو چیک کیا اسے کوئی خرابی نظر نہیں آئی۔ ایندھن بھی موجود تھا۔ تاہم اس نے انجن کو کھول کر باریک بینی سے جائزہ لینا شروع کر دیا۔ اچانک گولی چلنے کی آواز اور ٹریور کی دلدوز چیخ نے اسے ہلا کر رکھ دیا۔ یہ انجن سے ٹکرایا اور گرتا پڑتا باہر آیا۔ اپنی بندوق پکڑ کر کیبن سے نکلا۔ مگر دیر ہو چکی تھی۔ وہ صرف اتنا دیکھ سکا کہ ٹریور پوری طرح سے سانپ کے قابو میں ہے۔ اس کے

فائر کرنے سے پہلے اینا کونڈا اپنے شکار کو لے کر پانی میں جا چکا تھا۔

اب ایک بھیانک جنگل تھا۔ لانچ خراب تھی جس کے گرد موت منڈلا رہی تھی اور کرٹس تھا۔ وہ سمجھ چکا تھا کہ سانپ اسے کبھی نہیں چھوڑے گا۔ اس کی آنکھوں میں خون اتر آیا۔ اس نے فیصلہ کیا کہ اس نے مرنا تو ہے ہی مگر اس سانپ کو نہیں چھوڑے گا جو اس کے دو عزیز ترین دوستوں کو نگل چکا تھا۔ ایک خیال بجلی کی طرح اس کے ذہن میں کوندا۔ یہ لپک کر تہہ خانے میں گیا اور بیٹری سے چلنے والی آری لے آیا۔ اسے چیک کیا۔ یہ بالکل درست تھی۔ اس کے بعد یہ لانچ کے بالکل وسط میں آنکھیں بند کر کے لیٹ گیا۔ آری اس کے بالکل پاس تھی۔ اس کی توقعات کے عین مطابق تھوڑی دیر کے بعد لانچ ہلی اور اس نے ادھ کھلی آنکھوں سے دیکھا۔ خوفناک منظر دیکھ کر اس کے پسینے چھوٹ گئے۔ اینا کونڈا اسے گھور رہا تھا۔ بلاشبہ یہ ایک بلا تھی۔ اس کا بھیانک سر' خوفناک منہ اور لال انگارہ آنکھیں اس کی طرف بڑھ رہی تھیں۔ فاصلہ کم ہوتا گیا۔ پانچ فٹ' چار' تین' دو بجلی کی تیزی سے کرٹس نے آری پکڑ کر اس کا بٹن دباتے ہوئے اینا کونڈا کے سر کو نشانہ بنالیا۔ سانپ اس کی حرکت کو دیکھ چکا تھا وہ ایک دم پیچھے ہٹا مگر آری نے اس کی گردن پر کافی گہرا گھاؤ لگایا۔ خون کا فوارہ اس کی آنکھوں پر پڑا۔ اسے کچھ دکھائی نہیں دے رہا تھا مگر یہ بڑی پھرتی سے اٹھا اور بائیں ہاتھ سے منہ کو صاف کرنے لگا۔ اس کی ٹانگوں پر اینا کونڈا کی کوڑے جیسی دم پڑی۔ ضرب بڑی شدید تھی۔ کرٹس الٹ کر گرا اور اس کے ہاتھ سے آری چھوٹ گئی۔ اس سے پہلے کہ وہ اٹھتا اینا کونڈا اس کے جسم سے لپٹ گیا۔ کرٹس کو اپنی ہڈیاں ٹوٹتی محسوس ہونے لگیں اور سانس رکنے لگا۔ آری اس سے صرف دو فٹ کے فاصلے پر تھی۔ اس نے اپنی پوری قوت لگا کر اپنا بایاں ہاتھ آزاد کیا اور بمشکل آری تک اسے لے گیا۔ سانپ کا بھیانک منہ اس کی طرف بڑھ رہا تھا اور اس کے دباؤ میں بھی شدت آرہی تھی۔ آخر کرٹس نے آری پکڑلی۔ اس نے اس کا بٹن دبایا اور اب سانپ کے لیے کوئی موقع نہ تھا کیونکہ یہ اسے پوری طرح لپیٹ چکا تھا۔ کرٹس نے سانپ کی گردن پر اسے رکھا اور بٹن دباتا چلا گیا۔ یہ اس وقت تک آری چلاتا رہا جب تک کہ اس کی گردن الگ نہ ہوگئی۔ کرٹس خون میں نہا گیا تھا۔ اس کے گرد سانپ کے بل کھل گئے تھے۔ اس کے دوستوں کا قاتل خونخوار اینا کونڈا اس کے قدموں میں کٹا پڑا تھا۔ اس نے اپنے دوستوں کا بدلہ لے لیا تھا۔ مگر اسے کوئی خوشی نہیں ہوئی تھی۔ اس کے عزیز ترین دوست لالچ کی وجہ سے موت کے منہ میں جا چکے تھے۔ لانچ ہلکے ہلکے چلتے ہوئے پانی میں بالکل ساکن کھڑی تھی۔ اس نے لکڑی پر جو بڑی محنت سے انہوں نے حاصل کی تھی لعنت بھیجی۔ دریا میں چھلانگ لگائی اور اسے پار کر کے جنگل میں گم ہوگیا۔ ☆☆☆

سہیلی بوجھ پہیلی!

آمنہ الماس، حیدر آباد

-1 دیکھی ہم نے رات کی رانی
جس کی آگ سے ٹپکے پانی

-2 نہ کھاتا ہے نہ پیتا ہے
باتیں کر کر جیتا ہے

-3 پانی پلایا اس کو تو پیتے ہی مر گئی
زندہ رہی تو کام میرے کتنے ہی کر گئی

-4 میری سہیلی وزیر آباد
چوٹی اُس کی میرے پاس

-5 اِدھر کاٹھ، اُدھر کاٹھ
اندر بیٹھے دُرگا داس

-6 کالی ماں کے گورے پوت
ان دونوں کے نئے کرتوت

-7 اِدھر چلمن اُدھر چلمن بیچ کلیجہ دھڑکے
امیر خسرو یوں کہیں دو دو انگل سر کے

-8 رہتا ہے وہ سب کے ساتھ
لیکن پھر بھی آئے نہ ہاتھ

-9 ایک ماہ کے بعد وہ آئے
میٹھے میٹھے گیت سنائے
ہم تم، سب کے دل بہلائے
کوئی اِس کا نام بتلائے

-10 تخت ہلا، باغ ہلے، ہل ہل گئے مکان
کیا ہے ایسی چیز جس کا ذکر کرے قرآن

-11 ہری چپاتی، مٹر کی دال
اس پر سالن سفید اور لال

-12 مٹی کی بنائی آگ میں پکائی
لوگوں نے خرید کر بستی بنائی

-13 سر پر آگ بدن پر پانی
واہ رے لڑکے تری جوانی

-14 سونا ہے، سنار نہیں
گنبد ہے، دروازہ نہیں

-15 چھوٹا منہ بڑا پیٹ
جل کو دیکھے جائے لیٹ

-16 ایک ڈبے میں تیس دانے
بوجھنے والے بڑے سیانے

(جوابات اسی شمارے میں دیکھیے!)

کیا آپ کو معلوم ہے؟

✸ "تعلیم و تربیت" بچوں کا مقبول ترین رسالہ ہے۔ ✸ "تعلیم و تربیت" بچوں کے تمام رسالوں سے زیادہ شائع ہوتا ہے۔ ✸ "تعلیم و تربیت" بچوں کے تمام رسالوں سے زیادہ خوبصورت ہے۔ ✸ "تعلیم و تربیت" کی قیمت اپنی بے مثال خوبیوں کے باوجود بہت کم ہے۔ ✸ "تعلیم و تربیت" ہر ماہ بچوں میں بے شمار انعامات تقسیم کرتا ہے۔

آٹوگراف

بڑے لوگوں سے ان کے پیغامات ان کی اپنی تحریر اور دستخط کے ساتھ حاصل کرنا جسے عرفِ عام میں "آٹوگراف" کہا جاتا ہے ایک نہایت دلچسپ اور بامقصد مشغلہ ہے۔ طرزِ تحریر انسانی شخصیت کی سوچ اور کردار و گفتار کی آئینہ دار ہوتی ہے اور یوں "آٹوگراف" عظیم شخصیات کے نصب العین اور ان کی سوچ کے حوالے سے ہمارے "حال اور مستقبل" کے لیے روشنی مہیا کرتے ہیں۔ کیا خیال ہے آپ کا؟ "آٹوگراف" لینے کا شوق یقیناً آپ کو بھی ہوگا۔

بچوں کو سب سے اوّل پاکستانی ہونے کا سبق دینا چاہیے

۷- مئی ۲۰۰۳ء

(جناب احمد ندیم قاسمی)

جوانوں کو مری آہِ سحر دے
پھر ان شاہیں بچوں کو بال و پر دے
خدایا آرزو میری یہی ہے
مرا نورِ بصیرت عام کر دے!

محمد اقبال

(شاعر مشرق علامہ محمد اقبال)

محمدؐ کی محبت دینِ حق کی شرطِ اوّل ہے
اسی میں ہو اگر خامی تو سب کچھ نامکمل ہے

حفیظ جالندھری
17/6/76

(قومی ترانے کے خالق ابوالاثر حفیظ جالندھری)

محبت ایسا دریا ہے
کہ بارش روٹھ بھی جائے
تو پانی کم نہیں ہوتا

(جناب امجد اسلام امجد)

تگ و دو میں کمی نہ کر لیکن
جو میسر ہے اس پہ شاکر رہ!

عبدالعزیز خالد

(جناب عبدالعزیز خالد)

پتنگ تجربے

پتنگ اڑانا یعنی Kite Flying ایک قدیم کھیل ہے۔ جس کی ابتدا آج سے تقریباً 2500 سال پہلے چین میں ہوئی تھی۔ اُس زمانے میں آج کل کی طرح رنگ برنگی، خوشنما اور مختلف شکلوں کی پتنگیں تو موجود نہیں تھیں تاہم اُس وقت شروع شروع میں لوگ بڑے بڑے پتوں کو آکاس بیل (Vines) کی مدد سے اڑایا کرتے تھے۔

یاد رکھیے! پتنگ بازی کا آغاز محض تفریح کے طور پر نہیں ہوا بلکہ کئی کام اور ضرورتیں اس کا باعث بنیں۔ کوریا میں پتنگوں کو جنگ کے زمانے میں دشمن کے علاقے پر لالٹینیں لگا کر چھوڑ دیا جاتا تھا جو فضا سے بم کی مانند زمین پر گرتی تھیں۔ کافی عرصے تک افریقہ میں بھی جنگی حربے کے طور پر پتنگ کا استعمال ہوتا رہا۔ ان جنگوں کو "Boer War" کہا جاتا ہے۔ کیپٹن بیڈن پاول نامی ایک شخص نے انگلستان میں جنگ کے دوران چھ پتنگوں کی مدد سے اپنے آدمیوں کو دشمن کی حدود میں جاسوسی کے لیے اتارا جو پتنگوں کے ساتھ لٹکی ہوئی ٹوکری میں چھپے ہوئے تھے۔ یہی کیپٹن بیڈن پاول بعد ازاں بوائے اسکاؤٹ تنظیم کا بانی بنا۔

پتنگیں موسمی حالات کا جائزہ لینے اور اہم معلومات حاصل کرنے کے لیے بھی استعمال کی جاتی ہیں۔ مختلف قسم کے آلات لگا کر ان کے ذریعے ہوا کا دباؤ ناپا جاتا ہے۔ اس قسم کی پتنگوں کی اڑان طوفان اور بارش کی بھی پیش گوئی کرنے میں مدد دیتی ہے۔

1825ء میں ایک برطانوی اسکول ٹیچر نے بڑے انوکھے انداز میں لوگوں کی توجہ حاصل کی۔ وہ اس طرح کہ اُس نے اپنی گاڑی کے ساتھ 28 فٹ لمبی پتنگ باندھی اور اڑتی ہوئی اس پتنگ کی مدد سے گاڑی انگلستان کی سڑکوں پر 25 میل فی گھنٹا کی رفتار سے چلائی۔ مشہور امریکی سائنسدان بنجمن فرینکلن نے پتنگوں کی اڑان کو کافی مقبولیت بخشی۔ اس نے ایک طوفان کے دوران پتنگ کی مدد سے ثابت کیا کہ آسمانی بجلی، عام بجلی ہی کی ایک قسم ہے۔ اس نے پتنگ کی ڈور کے آخر میں ایک چابی لگائی اور جب ڈور کے ذریعے آسمانی برقی رو پہنچی تو اُسے اس کی موجودگی کا بخوبی اندازہ ہوا۔ بنجمن فرینکلن کو پتنگ اڑانے کا بڑا شوق تھا۔ وہ اپنی کمر کے ساتھ اڑتی پتنگ باندھ کر اس کی مدد سے تالاب میں تیراکی کا مزہ لیتا تھا۔

گراہم بیل، ٹیلی فون کے موجد نے مثلث نما خلیوں کی مدد سے بڑی بڑی پتنگیں تیار کی تھیں۔ اس کی پتنگوں کے خلیوں کی تعداد 3000 تک ہوتی تھی جن کی مدد سے کوئی آدمی ہوا میں بھی اڑ سکتا تھا۔

رائٹ برادران جنھوں نے پہلا ہوائی جہاز اڑایا تھا، ان کا جہاز بالکل ایک ڈبہ نما پتنگ ہی کی شکل کا تھا۔ دراصل وہ کئی سالوں تک پتنگوں پر تجربے کرتے رہے اور پھر انہی تجربوں کی روشنی میں انہوں نے پہلا ہوائی جہاز تشکیل دیا۔

پتنگوں کی بہت سی قسمیں ہوتی ہیں۔ زیادہ مشہور فلیٹ کائٹ (Flat Kite) اور بوکس کائیٹ (Box Kite) ہیں۔ پتنگوں کی ایک خاص قسم وہ ہے جو بالکل ڈریگون کے مشابہ ہے۔ اس قسم کی پتنگیں چین، جاپان، کوریا اور بنکاک وغیرہ میں خاصی مقبول ہیں اور تہواروں پر عوامی دلچسپی کا باعث بنتی ہیں۔

☆☆☆

سید شوکت اعجاز

حیران کُن

جھومنے والی چٹانیں

ارجنٹائن میں چٹانوں کے عجیب و غریب نظارے دیکھنے میں آتے ہیں۔ کئی چٹانوں کا وزن 700 پونڈ سے بھی زیادہ ہوتا ہے۔انہیں Rocking Stone کہا جاتا ہے یعنی جھومنے والے پتھر جو تیز ہوا کے چلنے پر باقاعدہ جھومتے ہیں۔ لیکن کیا مجال کہ گر جائیں۔ اگر کبھی اتفاقاً آپ کو بادام توڑنے کی ضرورت پیش آئے تو ہاتھ کی ذرا سی حرکت سے ان جھومتی چٹانوں کے نیچے رکھ کر آپ بادام توڑ سکتے ہیں۔

سرد ترین مقام

اگر آپ سے پوچھا جائے کہ دنیا کا سرد ترین مقام کونسا ہے تو آپ کا جواب یقیناً قطب شمالی (North Pole) ہوگا لیکن یہ آپ کا محض خیال ہے۔ دراصل روس کے کئی علاقے قطب شمالی کے علاقوں سے بھی زیادہ سرد ہیں۔ اب آپ یہ سن کر اور بھی حیران ہوں گے کہ قطب شمالی میں چند ایک علاقے ایسے بھی ہیں جہاں کا درجہ حرارت اکثر 85 درجے فارن ہائٹ سے بھی بڑھ جاتا ہے جو کہ اوسط گرم ملکوں کے موسم گرما سے بھی زیادہ ہے۔

طویل ترین نام

تھائی لینڈ کے دارالحکومت بنکاک کا نام طویلترین ہے۔ اس کا سرکاری نام دراصل KRUNGT`EP ہے جس کے بعد ایک لمبی لائن توصیفی الفاظ کی ہے جن کی تعداد 158 حروف پر مشتمل ہے۔

ہے نا عجیب بات!

افریقی بیبون (Baboon) بندر نے 9 سال تک ریلوے سگنل بدلنے میں اپنے مالک، سگنل مین "جیک" کی مدد کی جس کی دونوں ٹانگیں حادثے میں کٹ گئی تھیں۔ اس تمام عرصے میں حیرت انگیز طور پر کبھی غلطی نہیں ہوئی۔

چھانگا مانگا

ضیاء الحسن ضیا

ملک کے مشہور و معروف شاعر۔ بچوں کا ادب ان کا خاص شعبہ ہے۔ ایک عرصہ سے آپ کی نظمیں "تعلیم و تربیت" میں باقاعدگی کے ساتھ شائع ہو رہی ہیں۔

اک دن ہم جو سیر کو نکلے' پہنچے چھانگا مانگا
دیکھ کے سارے ہی خوش خوش تھے بچے چھانگا مانگا

جھیل کے دیکھے حسیں نظارے دلکش پیارے پیارے
ایسا منظر کہیں نہ دیکھا ہم نے اس سے پہلے

ریل میں بیٹھے بچے مل کر موج اڑائی سب نے
اپنی اپنی مرضی کی ہر چیز ہی کھائی سب نے

کشتی میں سب بیٹھ کے گھومے' مستی میں سب جھومے
کشتی کے ہچکولوں سے پھر لطف اٹھایا سب نے

چھانگا مانگا کا اک اپنا حسن ہے پیارے بچو!
تم بھی مل جل کر سب جا کے چھانگا مانگا دیکھو!

پیڑوں کے دلچسپ نظارے سب کا دل بہلائیں
تازہ تازہ ٹھنڈی ہوائیں اپنی شان دکھائیں

یہ نزدیک پتوکی کے ہے' بس میں بیٹھ کے جاؤ
پاکستان میں کیا کیا ہے یہ تم بھی دیکھ کے آؤ

چھانگا مانگا کے جنگل کے نام کو جانتے ہیں سب
اس کی شان اور عظمت کو بھی دل سے مانتے ہیں سب

اپنی دھرتی کو اللہ نے حسن سے خوب نوازا
وہی محافظ ہے ہم سب کا' شکر کریں سب اس کا

کھانا کھا کر موج اڑا کر اپنے گھر سب آئے
اپنے اپنے دامن کو سب خوشیوں سے بھر لائے

دلکش: خوبصورت' دل کو اچھا لگنے والا   پیڑ: درخت   پتوکی: لاہور کے قریب واقع ایک پُررونق قصبہ

ماسی برکتے

محمد فاروق دانش

معروف دانشور اور ادیب۔ 1979ء سے لکھنے کا آغاز کیا۔ نیشنل بک فاؤنڈیشن سے متعدد بار انعام حاصل کر چکے ہیں۔ "تعلیم و تربیت" کے لیے باقاعدہ لکھتے ہیں۔ ور خوب لکھتے ہیں!

ماسی برکتے بڑی بے دلی سے برتن دھو رہی تھی۔ اس کی نگاہیں سامنے کچن کی دیوار پر مرکوز تھیں جبکہ ہاتھ نلکے کے نیچے موجود برتنوں پر بے ترتیب چل رہے تھے۔

"کیا بات ہے برکتے' تمہارا دھیان اپنے کام کی طرف نہیں ہے!"

"جج...... جی...... نن...... نہیں...... تو...... ایسی تو......" وہ مالکن کی اچانک آمد پر بوکھلا اٹھی۔

کوئی پریشانی لگتی ہے شاید!" مالکن نے سنجیدگی سے کہا۔

"نہیں وہ...... کوئی بات نہیں......" وہ فیصلہ نہیں کر پائی کہ اپنی مالکن سے کچھ کہے یا نہ کہے۔

"دیکھو برتن دھو کر ایک کپ چائے میرے کمرے میں لے آؤ"۔ بیگم صاحبہ نے یہ کہا اور اپنے کمرے میں چلی گئیں۔

کاج میں لگ گیا۔ اس کو اپنے بچے کے بار بار کے ہونے والے بخار نے بھی کوئی خاص متوجہ نہ کیا۔ وہ بخار کی عام اشتہاری گولیاں کھلا کھلا کر اس کی تکلیف کو دبا کر مطمئن ہوتی رہی کہ بچہ ٹھیک ہے' یونہی کبھی کبھار نزلہ ہو جاتا ہے۔ اسے کیا معلوم تھا کہ اس کا بچہ اپنی بیماری سے باہر آ ہی نہیں سکا بلکہ اس کا مرض اندر ہی اندر بڑھ رہا ہے۔

جب اس کا بخار بار بار گولیاں کھلانے کے باوجود نہیں اترا اور اس کی کمزوری صاف ظاہر ہونے لگی' پیٹ پھولنے لگا تو اس نے پہلے محلے کے ڈاکٹر کے پاس بھاگ دوڑ کی۔ بعد میں اسے ہسپتال تک جانا پڑا۔ رپورٹوں کے بعد ڈاکٹروں نے بچے کو "ہپاٹائٹس بی" بیماری کی تشخیص کی۔ یہ سن کر غریب ماں بے موت ماری گئی۔ وہ ٹی وی پر دیکھتی تھی کہ یہ بیماری بے حد خطرناک ہے۔ لوگ کہتے تھے کہ اس بیماری کا شکار مریض کبھی ٹھیک نہیں ہو سکتا بلکہ اپنی جان سے ہاتھ دھو بیٹھتا ہے۔

چائے دینے کے بعد وہ بیگم صاحبہ کے پاس بیٹھ گئی۔

ماسی برکتے کے چہرے پر ناگواری کے تاثرات ابھر آئے۔

ان دنوں وہ شدید پریشانی کا شکار تھی۔ پچھلے سال اس کے چھ سالہ بچے کو یرقان ہو گیا تھا۔ مختلف علاج اور ادھر ادھر کے ٹوٹکوں کے بعد بچے کی حالت سنبھل گئی تھی اور وہ کھانے پینے لگا اور تھوڑا بہت کھیل کود میں حصہ لینے لگا تھا۔ غریب ماں کو اور کیا چاہیے تھا۔ وہ بچے کی طرف سے مطمئن ہو گئی اور پھر سے اس کا ذہن اپنے کام

"وہ بیگم صاحبہ' مجھے...... ہزار روپوں کی سخت ضرورت آن پڑی ہے؟" اس نے چہرے پر اداسی طاری کرتے ہوئے کہا۔

"ایک تو تم ایڈوانس بہت لیتی ہو"۔ بیگم صاحبہ نے چائے کی چسکی بھرپور آواز میں لیتے ہوئے کہا۔ "اب تمہیں کیا ضرورت پیش آ گئی"۔

"وہ جی منا ایک بار پھر شدید بیمار ہو گیا ہے!"

"اور تم اس کے لیے رقم کا مطالبہ کر رہی ہو گی"۔ صاحب

کمرے میں ابھی ابھی داخل ہوئے تھے۔ انہوں نے ماسی برکتے کا آخری جملہ سنا تو منہ بنا کر بولے۔

"بالکل ٹھیک سمجھا صاحب آپ نے!" وہ صاف گوئی سے بولی۔

"ارے ماسی، ہم محنت کر کے کماتے ہیں۔ نوٹ کوئی ہمارے ہاں کسی درخت پر تو نہیں لگتے، جو سب کو دیتے رہیں" وہ سخت لہجے میں بولے۔

"صاحب میں جو رقم ایڈوانس میں لیتی ہوں وہ اپنی تنخواہ میں سے کٹوا تو دیتی ہوں"۔

"تو کوئی احسان تھوڑا ہی کرتی ہو، ہماری جو رقم ہوتی ہے وہی تو لوٹاتی ہو وہ بھی کافی عرصے بعد"۔

"کیا کروں صاحب، بچے کو روگ ہی ایسا لگا ہے کہ خرچہ تو کرنا پڑتا ہے"۔ وہ سنجیدگی سے بولی۔

"خواہ مخواہ خرچہ کر رہی ہو تم اس پر"۔ وہ تیزی سے بولے۔

صاحب کی سخت باتیں سن کر برکتے کا چہرہ اتر گیا۔

"ارے رہنے بھی دیں چھوڑیں"۔ بیگم صاحبہ نے کہا۔

"آپ چپ رہیں جی، درست مشورہ دینا بھی ضروری ہوتا ہے"۔ وہ جانے کس ترنگ میں تھے۔ آج وہ ماسی کو کھری کھری سنانے کے موڈ میں تھے۔ "سنو ماسی! ہیپاٹائٹس بی اور سی کا علاج پاکستان تو کیا پورے یورپ اور امریکا جیسے ملکوں میں بھی نہیں ہے۔ تم بے کار میں پیسہ ضائع کر رہی ہو۔ محنت کی رقم یوں ضائع کرنے کے بجائے تم اسے کسی سرکاری ہسپتال میں داخل کرا دو۔ کم سے کم تمہارا پیسہ تو بچے گا"۔ انہوں نے ماسی کو انوکھا مشورہ دیا۔

"اور اسے وہاں مرنے کے لیے چھوڑ دوں"۔ اب کی بار وہ بھی کچھ سخت ہو گئی۔

"رقم خرچ کر کے کون سا تم اسے بچا پاؤ گی"۔ انہوں نے گویا اپنی حکمت بیان کی۔

"رقم نہیں دیتے تو نہ دیں صاحب جی!" وہ روتے ہوئے بولی۔ "مگر ایسی دل جلی باتیں تو نہ کریں"۔

"دے دیں ناں رقم"۔ ان کی بیگم نے ماسی کی آنکھوں میں آنسوؤں کی تاب نہ لاتے ہوئے کہا۔ "رو رہی ہے بے چاری!"

"مجھے ان آنسوؤں کی قطعی کوئی پرواہ نہیں۔ کام کرتی ہے تو کرے، ورنہ کوئی اور جگہ دیکھ لے"۔ وہ بے حد غصے میں تھے۔ انہوں نے شاید اس سے چھٹکارے کا ارادہ کر لیا تھا۔ "ہم نے کوئی ان بے چاریوں کا ٹھیکہ نہیں لے رکھا"۔

صاحب طبیعت کے کچھ تیز تو تھے لیکن آج وہ کچھ زیادہ ہی بول گئے۔ شاید اس کی وجہ یہ ہو کہ ماسی تین تین ماہ کی تنخواہ ایڈوانس لے لیتی تھی۔ بچے کی وجہ سے اکثر چھٹیوں پر چلی جاتی تھی۔ یعنی بزنس کے حساب سے ان کا کام کم ہوتا تھا اور رقم زیادہ لگتی تھی۔ اس لیے آج انہوں نے ماسی کی طبیعت صاف کر دینا ہی مناسب سمجھا۔ بیگم صاحبہ نے ماسی کو روکنے اور چپ کرانے کی کوشش کی لیکن وہ نہ رکی اور اپنے آنسوؤں کو اپنے دامن سے صاف کرتی ہوئی اپنے گھر چلی گئی۔ اس کے بعد وہ کبھی اس گھر کی طرف نہ گئی۔ اس کا سو پچاس روپے کا حساب اپنے مالکوں کی طرف رہا تھا لیکن اب اُسے ان کی رقم کی ضرورت نہیں رہی تھی۔

وہ خاتون ہسپتال میں پریشانی کے عالم میں ادھر سے ادھر پھر رہی تھیں۔ ایک دو کمروں میں نرس اور ڈاکٹروں سے بات چیت کے بعد وہ وارڈ کے انچارج کے پاس موجود تھیں۔

"جج...... جی...... وہ میرا بیٹا!" انہوں نے کسی قدر ہکلاتے ہوئے کہا۔

"میں نے آپ کے بیٹے کی تمام رپورٹس پڑھی ہیں اس کا بغور معائنہ بھی کیا ہے"۔ انچارج نے وضاحت کرتے ہوئے کہا۔ "پورے کیس کی اسٹڈی کے بعد......" وہ کچھ لمحے رکا۔ "دیکھئے خاتون! میں دراصل کسی کو غلط آسرے میں رکھنے کا قائل نہیں بلکہ سچ بات کہنے اور سننے پر یقین رکھتا ہوں"۔

"جی، مجھے بتائیں ڈاکٹر صاحب! میرے بچے کا کیا بنے گا؟" وہ شدید پریشانی کے عالم میں بولیں۔

"مجھے افسوس ہے خاتون کہ آپ کا بچہ اب مشکل ہی بچے گا"۔ وہ سنجیدگی سے بولے۔

"یہ...... یہ آپ کیا کہہ رہے ہیں ڈاکٹر صاحب!" وہ خاتون رونے لگی۔ اسے اپنے بیٹے کی نازک طبیعت کا مکمل اندازہ تھا لیکن

وہ اس انداز کی کسی بات کو سننے کے لیے تیار نہ تھیں اور پھر ماں تو آخر ماں ہوتی ہے!

"بی بی بات اصل میں یہ ہے کہ آپ کے بچے کو پہلے ورم جگر کی شکایت تھی۔ ٹیسٹوں کے بعد پتا چلا کہ اسے ہیپاٹائٹس بی ہے بعد میں یہ مرض بڑھتا رہا جو سی میں تبدیل ہو گیا۔ ورم جگر کے بعد اس کا جگر سکڑنا شروع ہو گیا اور اب وہ بمشکل اپنے کام انجام دے رہا ہے۔ اگر انسان کا جگر جو کہ خون بنانے میں اہم کردار ادا کرتا ہے' اگر کام کرنا چھوڑ دے تو پھر اس مریض کا بچنا مشکل ہو جاتا ہے"۔ انہوں نے تفصیل سے کہا۔

"میں اپنے بچے کے لیے ہر طرح کا خرچہ کرنے کو تیار ہوں۔ آپ مجھے کوئی ایسا ملک کوئی ایسا ڈاکٹر بتایئے جہاں اس کا علاج ممکن ہو میں ہر طرح کا خرچہ کر کے اس کی جان بچانا چاہوں گی"۔ وہ بولیں۔

"خاتون! یہ ایسا خطرناک مرض ہے جو ایک بار کسی کو لگ جائے تو تمام عمر اس کا وائرس اس کے ساتھ رہتا ہے۔ اس لیے اب کچھ نہیں ہو سکتا"۔

اپنے 24 سالہ بیٹے کی جان بچانے کے لیے اُس خاتون نے بنگلہ 'کار' بینک بیلنس سب کچھ داؤ پر لگا دیا تھا لیکن افسوس اکہ اس کا بیٹا صحت یاب نہ ہو سکا۔ چند سال قبل اس کے شوہر بھی اس مہلک بیماری میں جان سے ہاتھ دھو بیٹھے تھے۔ ان کا معاملہ تو اچانک ہی ہوا تھا۔ ایک دم طبیعت بگڑی' الٹیاں شروع ہوئیں۔ الٹیوں کے ساتھ خون آنا شروع ہو گیا۔ ٹیسٹ ہوئے تو پتا چلا کہ سوزش جگر کے ساتھ جگر میں پھوڑا بھی بن چکا ہے۔ دوران علاج اس دنیا سے رخصت ہو گئے۔ اب ان کے بیٹے کو بھی یہی روگ لگ چکا تھا۔ وہ اپنے شوہر کی تمام جمع پونجی اس کے علاج پر خرچ کر چکی تھیں۔ اس کے باوجود ان کے بچے کی بیماری کے خاتمے کی کوئی صورت نہ نکل سکی۔

گھر پر ملنے آنے والی عورتوں میں سے ایک نے انہیں بتایا کہ "سیالکوٹ میں ایک ڈاکٹر نے جگر کی بیماریوں کے علاج کے لیے ہسپتال کھولا ہے۔ وہاں سے سینکڑوں مریض ٹھیک ہو چکے ہیں" اسے فکر تھی کہ نہ جانے وہاں پر کتنی فیس لی جاتی ہے لیکن جب اسے علم ہوا کہ وہاں کی فیس خاصی نارمل ہے اور اس کے علاوہ یہ بھی کہ اگر کوئی فیس نہ دے سکنے کی پوزیشن میں ہو تو اس کا علاج

انمول موتی

- حکمت ایک ایسا درخت ہے جو دل میں اُگتا ہے اور زبان سے پھل دیتا ہے۔
- سب سے بڑی فتح اپنے نفس پر قابو پانا ہے۔
- دنیا میں مہنگی ترین چیز عزت اور دوستی ہے۔
- خوبصورتی کا سرچشمہ دل ہے۔ اگر یہ سیاہ ہے تو چمکتی آنکھ بھی کچھ نہیں کر سکتی۔
- عافیت اور امن درکار ہے تو آنکھ اور کان سے زیادہ کام لو اور زبان بند رکھو!
- انسان کی قابلیت اس کی زبان میں پوشیدہ ہے۔
- پیش کرنے کا انداز تحفے سے زیادہ قیمتی ہوتا ہے۔

مفت بھی کیا جاتا ہے۔ نفسانفسی کے اس دور میں اس قسم کے ڈاکٹروں کا ملنا کسی معجزے سے کم نہیں تھا۔ اس نے تہیہ کر لیا کہ وہ اپنے بچے کی جان بچانے کے لیے سیالکوٹ ضرور جائے گی۔

سیالکوٹ پہنچ کر انہیں کسی پریشانی کا سامنا نہیں کرنا پڑا۔ ہسپتال بہت مشہور تھا۔ وہ وہاں پہنچیں تو خوش اخلاق عملے نے ان کا استقبال کیا۔ شعبہ معلومات نے ان سے یہ معلوم کیا کہ ان کے پاس علاج کے لیے رقم ہے کہ نہیں۔ انہوں نے ہاں میں جواب دیا تو ایک ہزار روپے کی مختصر رقم جمع کر کے ان کے بیٹے کو ہسپتال میں داخل کر لیا گیا۔

ابتدائی معائنے کے بعد وارڈ کے رجسٹرار نے ان کے بیٹے فیضان کے کیس کی فائل تیار کی۔ انہیں بتایا گیا کہ وارڈ کے انچارج ماہر امراض جگر' ڈاکٹر جاوید کا دورہ شام پانچ بجے ہو گا جو اس کا تفصیلی معائنہ کریں گے۔

شام ٹھیک پانچ بجے ڈاکٹر جاوید وارڈ میں داخل ہوئے۔ یہ ایک بااخلاق نوجوان تھے۔ وہ ہر مریض کو نہایت اطمینان سے دیکھ رہے تھے۔ وہ ان کے چارٹ کو دیکھتے' ضروری ہدایت دیتے اور پھر کسی اور مریض کی طرف متوجہ ہو جاتے۔ ان کی دلکش مسکراہٹ مریض کی آدھی بیماری ویسے ہی دور کیے دے رہی تھی۔ بیگم صاحبہ ان کی خوش اخلاقی اور بھرپور توجہ دیکھ کر بے حد متاثر ہوئیں۔ جب ان کی باری آئی تو وہ ان کے بیٹے فیضان کے چیک اپ میں لگ گئے۔ انہوں نے ان سے اس کی بیماری کے شروع ہونے اور اس وقت سے اب تک کرائے جانے والے تمام علاج کی پوری تفصیل معلوم کی۔ سابقہ ریکارڈ دیکھا۔ نئے ٹیسٹوں کی رپورٹ دیکھی۔ تمام امور طے کر چکنے کے بعد انہوں نے انہیں بتانا شروع کیا: "ہیپاٹائٹس اس وقت بہت تیزی سے پھیل رہا ہے۔ جگر کی اس بیماری کے مریض دنیا کے تقریباً تمام ممالک میں پائے جاتے ہیں۔ اگر اس بیماری سے لاپرواہی برتی جائے تو اس سے جگر میں ناسور ہونے کے امکانات بڑھ جاتے ہیں۔ اس سے ہم اس مرض کی سنگینی کا اندازہ لگا سکتے ہیں"۔

انہوں نے ڈاکٹر کی باتوں کو غور سے سنا۔ ڈاکٹر نے انہیں اطمینان دلایا کہ فکر کی کوئی بات نہیں ہے۔ ان کے علاج اور اللہ کی رضا سے سینکڑوں مریض صحت یاب ہو چکے ہیں۔ انہوں نے بتایا کہ ڈاکٹری علاج کے ساتھ ساتھ ہمارے پاس طب اسلامی کی ایک خاص دوا ہے جو اس مرض کے وائرس کو بتدریج ختم کر دیتی ہے۔ یہ طبی نسخہ صبح سویرے استعمال کرایا جاتا ہے اور یہ ہسپتال کی ڈائریکٹر اپنے ہاتھ سے مریضوں کو استعمال کراتی ہیں۔ آپ کے بچے کے لیے یہ علاج کل صبح سے شروع ہو جائے گا۔ رات تک انہوں نے ڈاکٹر کی ہدایت کے مطابق ادویات استعمال کرائیں۔ اگلی صبح جب ہسپتال کی ڈائریکٹر وارڈ میں داخل ہوئیں تو بیگم صاحبہ اسے غور سے دیکھنے لگیں۔ جب وہ فیضان کے بستر پر پہنچیں تو وہ حیرت سے چلا اٹھیں:

"ارے برکتے تم......" وہ ماسی برکتے کو پہچان گئی تھیں۔

"بیگم صاحبہ آپ......" وہ بھی اپنی پرانی مالکن کو پہچان گئیں۔ "آپ اور یہاں...... کیسے؟" انہوں نے حیرانگی سے سوال کیا۔

"میرا بیٹا موت اور زندگی کی کشمکش میں ہے"۔ وہ روہانسی ہو کر بولیں۔ "میں اس ہسپتال کی شہرت سن کر یہاں تک پہنچی ہوں"۔

"اللہ آپ کے بیٹے کو شفا دے گا۔ وہ بڑا مہربان ہے' آپ کی مشکل ضرور دور کرے گا"۔

"تم...... یہاں...... کیسے؟"

"سیٹھ صاحب کی جھڑکیوں اور ان کی حوصلہ شکنی نے مجھے مایوس کر دیا تھا"۔ ماسی برکتے نے اپنی کہانی بیان کرنا شروع کی: "میں اپنے بچے کی زندگی سے مایوس ہو چکی تھی۔ ایسے میں مجھے کسی نے بتایا کہ ایک خداترس بزرگ سیالکوٹ میں اس مرض کا بڑی کامیابی سے علاج کر رہے ہیں۔ وہ اس علاج کی کوئی فیس بھی نہیں لیتے"۔ اس نے کہا۔ "میرے پاس رقم بھی نہیں تھی۔ اس کے باوجود میں ٹرین میں بغیر ٹکٹ کے سوار ہو گئی۔ ٹرین میں چیکر سے منت سماجت کر کے میں باباجی تک پہنچنے میں کامیاب ہو گئی"۔ وہ سنجیدگی سے اپنی کہانی بیان کر رہی تھی۔ "بابا نے دعا اور دوا کے ذریعے علاج شروع کیا۔ وہ کہتے ہیں نا کہ جب شفا ہونے پر آئے تو لاکھوں کی دوائی کام نہیں کرتی اور کوئی ایسا نسخہ جسے ہم بالکل معمولی

سمجھ رہے ہوں، وہ کام کر جاتا ہے۔ ایسا ہی کچھ بابا کے پاس آکر میں نے محسوس کیا۔ جوں جوں اس کا علاج ہوتا گیا۔ وہ ٹھیک ہوتا چلا گیا۔ ایک نیک دل شخص نے مجھے اپنے ہاں ملازمت بھی دے دی۔ سچ کہا ہے کسی نے، جس کا کوئی نہیں ہوتا اس کا اللہ ہوتا ہے"۔ اس کی آنکھیں پُرنم ہو گئیں۔ وہ بہت ڈوب کر اپنی آپ بیتی سنا رہی تھیں: "بیٹے کا علاج ہو چکا تو میں نے اسے پڑھنے لکھنے پر لگا دیا۔ اس کے تمام اخراجات کا ذمہ صاحب نے لے لیا۔ بابا کی ضعیفی کے سبب میں ان کے مریضوں کے سلسلے میں ان کا ہاتھ بھی بٹانے لگی تھی۔ بابا کی وصیت تھی کہ اس بیماری کے خلاف جہاد جاری رہنا چاہیے۔ انہوں نے مجھے دوائی بنا کر اسے ضرورت مندوں تک

پہچانے کی تلقین کی تھی"۔

"تو تمہارا بیٹا؟" بیگم صاحبہ نے سوال کیا۔

"وہ پڑھ لکھ کر ڈاکٹر بن گیا۔ صاحب کے تعاون سے ہم نے یہاں پر ہسپتال کھول لیا۔ اب میں آپ کے سامنے موجود ہوں"۔

"تو کیا...... تو کیا...... ڈاکٹر جاوید تمہارا بیٹا ہے؟" وہ شدید حیرانگی کے عالم میں بولیں۔

"جی ہاں! یہ وہی جاوید ہے جسے ایک روز صاحب نے مردہ قرار دے کر دھتکار دیا تھا۔ ان کا کہنا تھا کہ میں اسے کسی سرکاری ہسپتال میں سسک سسک کر مرنے کے لیے پھینک آؤں لیکن قدرت کا کرشمہ دیکھئے کہ وہ بچہ نہ صرف یہ کہ اللہ کی رضا سے بچ گیا بلکہ آج وہ اپنے ہی جیسے مرض میں مبتلا لوگوں کے علاج میں مصروف ہے۔ یہ بھی قدرت ہی کا کرنا ہے کہ آج آپ کا بچہ بھی اس کے علاج کا متمنی ہے۔ مجھے یہ کہنے کا حق دیجئے کہ زندگی اور موت کا اختیار صرف اللہ کو حاصل ہے۔ وہ چاہے تو مردے میں جان ڈال دے۔ پھر ہم زندہ کو مرا ہوا کہنے والے کون ہوتے ہیں؟" انہوں نے بہتے ہوئے آنسوؤں کے ساتھ اپنی سابقہ مالکن کو بتایا۔ بیگم صاحبہ اب اپنے شوہر کے ناروا سلوک پر سوائے پچھتانے کے اور کیا کر سکتی تھیں۔

☆☆☆

پیٹو اژدہا

"پائتھون" (Python)

"پائتھون" دنیا کا سب سے زیادہ پیٹو اژدہا ہے۔ یہ ایک سالم چیتے کو نگل سکتا ہے اور اگر اسے قابو کرنا ہو تو کم از کم 12 ہٹے کٹے انسانوں کی ضرورت پڑتی ہے۔

کراچی۔ شہرِ بے مثال

ناصر زیدی

ملک کے نامور شاعر۔ ایک مدت سے تعلیم و تربیت میں شائع ہونے والی ان کی نظمیں بچوں میں بے حد پسند کی جاتی ہے۔

یہ شہر، بے مثال ہے اس کا نہیں جواب
علم و ادب کے روز کھلاتا ہے یہ گلاب

اس میں مزارِ قائدِاعظمؒ ہے دیدنی
پھیلی تھی جن کے دم سے اخوت کی روشنی

اس سرزمینِ پاک کا جن سے وجود ہے
جن کے سبب سے قوم کی نام و نمود ہے

وہ قوم جس کو ایٹمی قوت عطا ہوئی
ربِ قدیر نے جسے بخشی ہے سرخوشی

پایا ہے جاں فشانی سے یہ ساحلِ مراد
نکلے بھنور سے جب تو لبوں پر تھا شاد باد!

دیدنی: دیکھنے کے قابل
قدیر: قدرت، طاقت رکھنے والا
ساحلِ مراد: مقصد، منزل

نام و نمود: جان پہچان، وجود
جاں فشانی: سخت محنت، جد و جہد
شاد باد: خوش رہے، آباد رہے!

باز آجائیں مگر وہ کامیاب نہ ہو سکا۔ جب ایرج ہر طرح سے بے بس ہو گیا تو بولا: "اے بھائیو! نہ مجھے ایران چاہیے اور نہ روم و چین۔ مجھے کسی بادشاہت اور تخت و تاج کی ضرورت نہیں ہے۔ میں سب کچھ تمہارے حوالے کرتا ہوں۔ میں تم سے لڑائی نہیں چاہتا۔ میرا ایسے تخت و تاج سے دل بھر گیا ہے جو سوائے دشمنی کے انسان کو اور کچھ نہیں دیتے۔ میں لالچی اور دولت پرست نہیں ہوں۔ میرے نزدیک پیار و محبت اور بھائی چارہ کسی بھی دولت اور تخت و تاج سے کم نہیں ہے"۔

صفِ اول کے معروف ادیب اور ماہر تعلیم۔ بچوں کا ادب ان کا خاص شعبہ ہے۔ ان کی بے شمار کہانیاں بچوں اور بڑوں سبھی سے خراج تحسین حاصل کر چکی ہیں۔ آپ اس وقت گورنمنٹ کالج' یونیورسٹی لاہور کے شعبہ فارسی سے منسلک ہیں۔

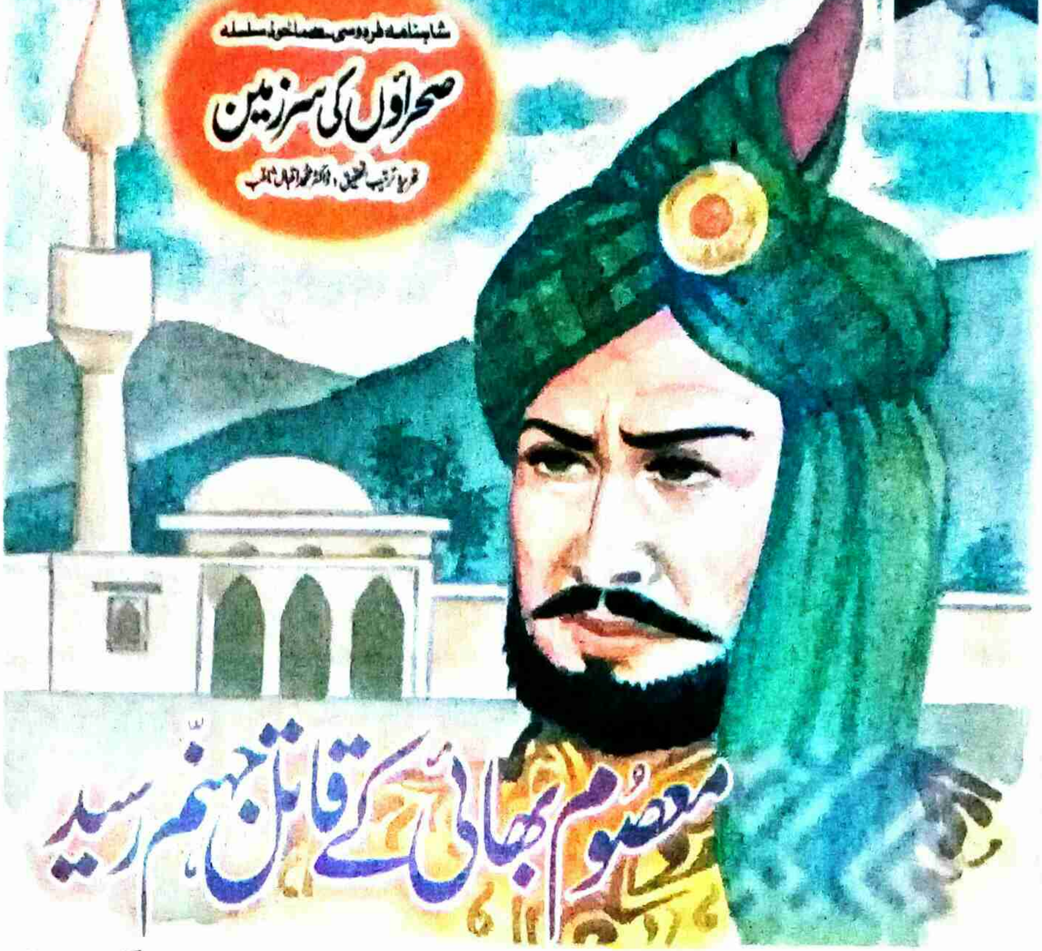

صبح ہوئی تو دونوں بدکردار بھائی ایرج کے خیمے میں داخل ہو گئے۔ ایرج ابھی ابھی بیدار ہوا تھا۔ اس نے بھائیوں کو دیکھا تو "صبح بخیر" کہا۔ لیکن انہوں نے ایرج کو نہایت سخت لہجے میں جواب دیا اور اس پر عجیب و غریب سوالات کی بارش کر دی۔ وہ دونوں مسلسل لڑائی کے لیے کوئی بہانہ تلاش کر رہے تھے اور ایرج کو جواب دینے کا موقع نہیں دے رہے تھے۔ انہوں نے پھر سے پرانے تنازعے کے بارے میں پوچھنا شروع کر دیا کہ "چھوٹا ہونے کے باوجود باپ نے تمہیں ہم پر کیوں برتری دی ہے؟ تو ایران کی بادشاہت سے کیوں دستبردار ہونا چاہتا ہے؟ یہ بھی تیری کوئی چال ہے جو تجھے شاطر باپ فریدون نے سکھائی ہے۔ تیرا ہمارے پاس اس طرح آنا بھی چالاکی ہے۔ کیا تو یہ نہیں چاہتا کہ ہمارے لوگوں کی نظروں میں ہمیں ذلیل و خوار کر کے ایک دن تمام مملکت پر قابض ہو جائے؟"

ایرج کو بھائیوں کے اس رویے پر بڑی حیرت ہوئی۔ اس نے بہت کوشش کی کہ وہ دونوں شیطان صفت اپنے اس رویے سے

یہ سب کچھ سننے کے بعد سلم نے تور سے کہا: "اس کی بکواس باتوں پر کان نہ دھرنا۔ یہ ہمیں فریب دینا چاہتا ہے"۔

تور کو بھی بڑا غصہ چڑھا ہوا تھا۔ وہ جس سنہری کرسی پر بیٹھا تھا اس سے اُٹھ کھڑا ہوا اور وہی کرسی اٹھا کر ایرج کو دے ماری۔ پھر اس نے خنجر کو نیام سے نکالا اور اونچی آواز میں دھاڑا: آج تمہارا تمام حساب چکا دوں گا"۔

ایرج نے جب یہ حالات دیکھے تو دکھ بھری آواز سے بولا: "بھائیو! نہ تمہیں خدا کا خوف ہے اور نہ باپ کی شرم۔ اپنے چھوٹے بھائی کے خون کے کیوں پیاسے ہو گئے ہو؟ تمہیں ایران کی بادشاہی چاہیے تھی' میں نے وہ بھی تمہیں دے دی ہے۔ اب میرا خون مت بہاؤ۔ میں دنیا کے کسی کونے میں چلا جاؤں گا اور محنت مزدوری کر کے اپنا پیٹ پال لوں گا۔ تمہارے آگے کبھی ہاتھ نہیں پھیلاؤں گا اور نہ ہی تمہیں کبھی نظر آؤں گا۔ خدا کے لیے مجھے مت مارو"۔

تور کی آنکھوں میں خون اترا ہوا تھا۔ اس نے بھائی کی ایک نہ سنی اور خنجر ایرج کے پہلو میں گھونپ دیا۔ وہ نیک دل چھوٹا بھائی

جو بڑے بھائیوں کی طرف صلح اور دوستی کا پیغام لے کر آیا تھا اپنی تمام نیک خواہشات کے ساتھ اس دنیا سے رخصت ہو گیا۔

دوسری طرف فریدون اپنے جگر کے ٹکڑے کی راہیں دیکھ رہا تھا۔ جب ایرج کی واپسی کا مقررہ دن آ گیا تو باپ اپنی فوجوں کے ساتھ شہر سے باہر آ گیا تا کہ بیٹے کا استقبال کر سکے۔ لیکن ایرج کی بجائے ایک خاک آلود سوار نمودار ہوا جس کے پاس ایک لکڑی کا تابوت تھا۔ فریدون نے سوار سے ایرج کے بارے میں پوچھا تو اس نے نالہ و زاری کرتے ہوئے تابوت کا دروازہ کھول دیا۔ فریدون نے جب تابوت کے اندر دیکھا تو دیکھتے ہی اپنے آپ پر قابو نہ رکھ سکا اور گھوڑے سے نیچے گر گیا۔ سلم اور تور نے اپنے چھوٹے بھائی کا سر تابوت میں رکھ کر باپ کی طرف روانہ کیا تھا۔

جب ایران کے لوگ اس واقعے سے آگاہ ہوئے تو ایرج کے سوگ میں ہر آنکھ اشکبار ہو گئی اور ہر دل غم کے سمندر میں ڈوب گیا۔ لوگ ایرج کی اچھی باتوں اور نیک خیالات کو یاد کر کے رو رہے تھے۔ ہر کوئی یہی کہہ رہا تھا کہ ایرج جیسا اچھا بادشاہ عوام کو کم نصیب ہوتا ہے۔ جہاں لوگ ایرج کی بے حد تعریف کر رہے تھے وہاں سلم اور تور پر لعنتیں بھی بھیج رہے تھے۔

ایرج کا کوئی بیٹا نہیں تھا۔ اُس کے مرنے کے بعد اللہ نے ایرج کے گھر ایک بیٹی دی۔ بیٹی جب جوان ہوئی تو اس کی شادی کر دی گئی اور اس کے ہاں ایک چاند جیسا بیٹا پیدا ہوا جس کا نام "منوچہر" رکھا گیا۔ ایرج کے مرنے کے بعد فریدون نے یہ پسند کیا کہ اپنے ہاتھ بیٹوں کے خون سے رنگے۔ اس نے انتظار کیا کہ ایرج کا نواسہ منوچہر جوان ہو جائے اور وہ اپنے نانے کے ناحق خون کا بدلہ لے۔ منوچہر جب جوان ہو گیا تو اس کو تمام حالات سے آگاہ کر دیا گیا۔ اس نے قسم کھائی کہ جب تک سلم اور تور سے اپنے نانے کے خون کا حساب نہیں چکائے گا آرام سے نہیں بیٹھے گا۔

سلم اور تور نے جب منوچہر کی بہادری اور دلیری کی داستانیں سنیں تو خوفزدہ ہو گئے۔ انہیں یقین ہو گیا کہ منوچہر ایک نہ ایک دن ایرج کے خون کا بدلہ ضرور لے گا۔ اسی خوف کے نتیجے میں وہ اکٹھے ہوئے اور سوچ بچار کرنے لگے۔ ان کو اپنی قسمت کا ستارہ ڈوبتا ہوا نظر آ رہا تھا۔ بالآخر انہوں نے فیصلہ کیا کہ منوچہر اور فریدون کی طرف

دوستی کا ہاتھ بڑھایا جائے۔ لہٰذا انہوں نے اپنا ایک کارندہ پیغام اور تحائف کے ساتھ فریدون کی طرف روانہ کیا۔ پیغام میں لکھا تھا۔

"اے ایران کے بادشاہ! ہمیشہ سلامت رہو۔ اپنے چھوٹے بھائی ایرج کی نسبت جو غلطی ہم سے سرزد ہوئی ہے ہم اس پر بے حد شرمندہ ہیں۔ داناؤں نے کیا خوب کہا ہے کہ ہر برے کام کا انجام بھی برا ہوتا ہے۔ ہم نے بھی جب سے ایرج کا خون کیا ہے رنج اور مصیبتوں میں مبتلا ہیں۔ ہم شیطان کے بہکاوے میں آگئے تھے اور لالچ کی وجہ سے ہمارے دماغ نے کام کرنا چھوڑ دیا تھا۔ اب آپ سے اُمید کرتے ہیں کہ ہمارا گناہ جتنا بھی بڑا ہے اسے درگزر کر کے ہمیں معاف کر دیں اور منوچہر کو ہماری طرف بھیج دیں تاکہ ہم اپنے آپ کو اس کی غلامی میں دے دیں۔ ہم چاہتے ہیں کہ اس طرح سے اپنے گناہ کا کفارہ ادا کریں"۔

فریدون نے جب یہ پیغام سنا تو آگ بگولہ ہو گیا اور پیغام رساں سے بولا:

"میں ان دونوں پلیدوں کی دلی خواہش کو خوب سمجھتا ہوں۔ ان بے شرموں سے کہو کہ تمہاری ان بے ہودہ باتوں کا کوئی یقین نہیں کر سکتا۔ تمہیں منوچہر سے کوئی ہمدردی نہیں ہے۔ بلکہ تم چاہتے ہو کہ اس کا بھی ایرج جیسا حشر کرو۔ یاد رکھو! تم کبھی منوچہر کا منہ نہیں دیکھ سکتے۔ اس کا ایک نہ ایک دن تم سے صرف میدان جنگ میں مقابلہ ہو گا اور وہ تم سے اپنے نانے کے خون کا حساب لے گا"۔

پیغام رساں کارندے نے فریدون کی زبانی جب یہ پیغام سنا تو کانپتا ہوا کھڑا ہو گیا۔ وہ جان چکا تھا کہ فریدون اب سلم اور تور کو کبھی معاف نہیں کرے گا۔ پیغام رساں یہ حالات دیکھنے کے بعد واپس روانہ ہو گیا۔ سلم اور تور نے باپ کا تندوتیز پیغام سنا تو دونوں خوف سے کانپ اُٹھے۔ انہوں نے فوراً سب کو جانے کا حکم دیا اور اکیلے بیٹھ کر صلاح مشورے کرنے لگے۔ آخر کار تور سے کہا: "اب ہمیں عیش و عشرت کی زندگی کو بھول جانا چاہیے۔ ہمیں چاہیے کہ اس سے پہلے کہ منوچہر تیاری کر کے ہم پر چڑھائی کر دے، ہم اس پر حملہ کر دیں"۔

سلم نے تور کی اس تجویز کو قبول کر لیا اور دونوں اسی روز سے حملے کی تیاری کرنے لگے۔ تھوڑے ہی وقت میں دونوں نے اپنے اردگرد ایک بہت بڑی فوج جمع کر لی۔ لشکر کے سرداروں اور سپہ سالاروں نے کسانوں اور چرواہوں کو بھی زبردستی فوج میں شامل کر لیا۔ عوام نہیں چاہتے تھے کہ ان دو ظالم بادشاہوں کی خاطر فریدون اور منوچہر سے جنگ لڑیں۔ مگر ڈر اور خوف کی وجہ سے کسی کو جنگ سے انکار کی جرات نہیں تھی۔ جب فوج کی تیاری مکمل ہو گئی تو ایران کی طرف کوچ کا حکم دے دیا گیا۔ جب سلم اور تور کا لشکر ایران کے قریب پہنچا تو فریدون کے جاسوسوں نے فوراً خبر پہنچا دی۔ فریدون نے منوچہر سے کہا کہ جلدی سے اپنے آپ کو جنگ کے لیے تیار کرو۔ منوچہر تو کئی سالوں سے اس دن کا انتظار کر رہا تھا۔ اس نے اپنے سپہ سالاروں کو بلایا اور فوراً تیاری کا حکم دیا۔ جب تیاری مکمل ہو گئی تو منوچہر نے فریدون سے اجازت لی اور سرحد کی طرف افواج کو لے کر روانہ ہو گیا۔

منوچہر کا لشکر جنگل اور بیابانوں کو عبور کرتے ہوئے سلم اور تور کے لشکر کے قریب پہنچ گیا۔ جب مخالف لشکر کو معلوم ہوا کہ منوچہر کا بہت بڑا لشکر جنگ کے لیے ان کے نزدیک پہنچنے ہی والا ہے تو ان پر خوف طاری ہو گیا۔ سلم اور تور ایک نہایت مضبوط قلعے کے اندر مقیم تھے۔ اس قلعے کی دیواریں اتنی بلند تھیں کہ ان کو عبور کرنا بہت مشکل تھا۔ منوچہر نے بھی اس قلعے کے نزدیک ایک جنگل میں اپنے لشکر کو پڑاؤ ڈالنے کا حکم دیا۔ لشکر نے پڑاؤ ڈالنے کے بعد پوری رات آرام کیا اور صبح کو جنگ کے لیے تازہ دم ہو گئے۔

اگلی صبح دونوں لشکر ایک دوسرے کے سامنے آگئے اور جنگ کے لیے تیار ہو گئے۔ اچانک جنگ شروع ہو گئی اور دونوں لشکر ایک دوسرے پر ٹوٹ پڑے۔ دونوں اطراف سے تیروں اور نیزوں کی بارش ہونے لگی۔ میدان جنگ خون سے بھر گیا اور اس قدر گرد و غبار اٹھا کہ فضا تاریک ہو گئی۔ شام تک مسلسل جنگ جاری رہی۔ دونوں فوجوں کے بے شمار سپاہی مارے گئے۔ آخر ایرانی لشکر سلم اور تور کے لشکر پر غالب آگیا۔ جب رات کی تاریکی چاروں طرف چھا گئی تو جنگ رک گئی تاکہ دونوں لشکر آرام کر سکیں۔

سلم اور تور جنگ سے تھکے ہارے شدید پریشانی کے عالم میں اپنے خیمے میں چلے گئے۔ ایک کی زرہ تلوار کے وار سے کٹ

گئی تھی اور دوسرے کی آہنی ٹوپی ٹوٹ گئی تھی۔ دونوں کے چہرے چھوٹے موٹے زخموں سے خون آلود تھے۔ ان دونوں کو اندازہ ہو چکا تھا کہ اب وہ مزید مقابلے کی طاقت نہیں رکھتے۔ بہت دیر تک صلاح مشورے کے بعد وہ اس نتیجے پر پہنچے کہ رات کے وقت جب منوچہر کا لشکر سو رہا ہو تو اس پر شب خون مارا جائے۔ اس سے پہلے کہ سلم اور تور کا لشکر منوچہر کے لشکر پر شب خون مارتا جاسوسوں کے ذریعے منوچہر کو اس حملے کی خبر مل گئی۔

منوچہر نے یہ خبر ملتے ہی تیس ہزار جنگجو سپاہیوں کو جنگل کے ایک کونے میں چھپنے کا حکم دیا تاکہ جونہی دشمن کے سپاہی شب خون مارنے آئیں تو اچانک ان پر ٹوٹ پڑیں اور ان سب کو موت کی نیند سلا دیں۔ آدھی رات کے وقت تور ایک لاکھ سپاہیوں کے ساتھ منوچہر کے لشکر پر شب خون مارنے کے لیے تیار ہو گیا۔ اس کا خیال تھا کہ منوچہر کا لشکر سو رہا ہے۔ لیکن جب تور کا لشکر ایرانی فوجوں کے نزدیک پہنچا تو یہ دیکھ کر حیران رہ گیا کہ منوچہر کا لشکر جاگ رہا ہے اور مقابلے کے لیے تیار ہے۔ اب تور کے لیے جنگ کے سوا کوئی چارہ نہ تھا۔ جنگ شروع ہو گئی اور سر تن سے جدا ہونے لگے۔ تھوڑی ہی دیر بعد تور کے سپاہی ہمت ہار گئے۔ منوچہر کے تیس ہزار سپاہیوں نے تور کے لشکر کو گھیرے میں لے لیا۔ تور نے جب خود کو ہر طرف سے گھیرے میں دیکھا تو اس نے راہ فرار اختیار کر لی۔ منوچہر نے جب اسے بھاگتے ہوئے دیکھا تو اس نے اپنے گھوڑے کو تور کے پیچھے لگا دیا۔ جب منوچہر اس کے نزدیک پہنچا تو اپنا نیزہ پوری قوت سے اس کی طرف اچھال دیا۔ نیزہ تور کی پشت پر لگا اور اس کے جسم کے آر پار ہو گیا۔ تور گھوڑے سے گر پڑا اور تڑپ تڑپ کر مر گیا!

تور کو جہنم رسید کرنے کے بعد منوچہر نے سلم کے لشکر پر حملہ کر دیا۔ سلم نے جب دیکھا کہ وہ مقابلے کی قوت نہیں رکھتا تو اس نے قلعے میں چھپ کر پناہ حاصل کرنے کی کوشش کی۔ منوچہر کے سپاہی قلعے کا پہلے ہی محاصرہ کر چکے تھے اور مورچہ بند ہو کر دشمن کا انتظار کر رہے تھے۔ سلم کا لشکر جب قلعے کی طرف آیا تو منوچہر کے مورچہ بند سپاہیوں نے ان پر اچانک حملہ کر دیا۔ پیچھے سے منوچہر بھی اپنے لشکر کے ساتھ آن پہنچا۔ ایک بار پھر خونریز

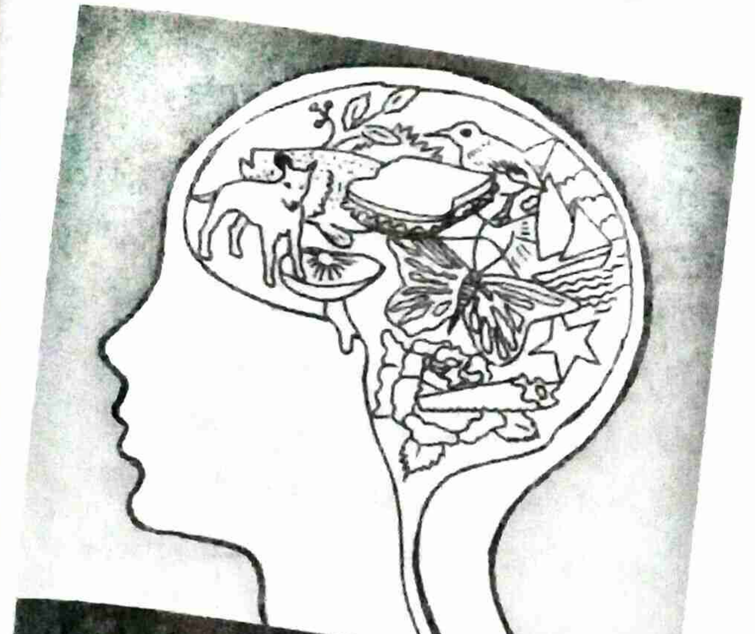

انسانی دماغ: ایک انسانی دماغ اوسطاً طبعی زندگی (تقریباً 70 سال) کے دوران 100 کھرب (100'000'000'000'000) معلومات محفوظ کرتا ہے۔

جنگ شروع ہو گئی۔ تھوڑی ہی دیر بعد سلم کے سپاہی حوصلہ ہار گئے اور میدان جنگ سے بھاگنے لگے۔ اسی دوران منوچہر کو سلم نظر آ گیا جو بھاگنے کی تیاری کر رہا تھا۔ مگر منوچہر کی تلوار نے اسے بھاگنے کی مہلت نہ دی اور وہ بھی تور کی طرح جہنم رسید ہو گیا۔ جنگ ختم ہو گئی اور منوچہر نے باقی سپاہیوں کے لیے عام معافی کا اعلان کر دیا۔ اس جنگ کے تھوڑے ہی عرصے بعد فریدون اس جہان سے رخصت ہو گیا اور منوچہر تمام سلطنت کا بادشاہ بن گیا۔

منوچہر کے دور حکومت میں اس کے ایک سپہ سالار "سام فریمان" کے ہاں کوئی اولاد نہیں تھی۔ اس نے اللہ کے حضور بہت التجائیں کیں۔ آخر کار اللہ نے اُسے ایک بیٹا دیا۔ جس کا نام "زال" رکھا گیا۔ سام نے جب یہ بچہ دیکھا تو خوفزدہ ہو گیا۔ اس عجیب الخلقت بچے کے تمام بال سفید تھے۔ سام فریمان نے کہا: "اے پروردگار! کیا میں نے کوئی بہت بڑا گناہ کیا ہے جو تو نے مجھے یہ سزا دی ہے۔ یہ بچہ تو کسی بھوت کا ہے میرا نہیں"۔

اس کے بعد سام نے حکم دیا کہ زال کو کسی ویرانے میں لوگوں کی نظروں سے دور چھوڑ آئیں۔ کارندوں نے سام کے خوف سے انکار نہ کیا اور ننھے زال کو چیختے چلاتے ویرانے میں چھوڑ آئے۔

(باقی آئندہ)

آپ بھی لکھیے

علم

عامر وقاص، راولپنڈی

"علم حاصل کرنا ہر مسلمان مرد اور عورت پر فرض ہے"۔ علم کے بغیر انسان اشرف المخلوقات کہلانے کا مستحق نہیں۔ جہاں علم کی روشنی نہیں وہ گویا وحشی جانوروں کا جنگل ہے۔

علم ہی سے انسان کے دل و دماغ منور ہوتے ہیں۔ اسی سے اس کے خیالات کو وسعت، عقل کو ضیاء اور تخیل کو بلند پروازی حاصل ہوتی ہے۔ حدیث پاکؐ ہے کہ "عالم کے قلم کی روشنائی شہید کے خون سے بھی اعلیٰ ہے"۔ علم سب طاقتوں کی سرتاج طاقت ہے۔ ایک عالم کی ذہنی و فکری طاقت لاکھ جاہلوں کی طاقت سے بدرجہا زیادہ ہوتی ہے۔ قرآن میں ارشاد ہے کہ "علم اور لا علم برابر نہیں ہو سکتے"۔

علم ہی سے انسان اپنی اور اپنے تمدن کی اصلاح کرتا ہے۔ اسی سے اس کی عادات اور اطوار میں شائستگی پیدا ہوتی ہے اور اسی سے اس کے اخلاق درست ہوتے ہیں۔ علم کے بغیر کسی فعل کے نیک و بد میں تمیز نہیں ہو سکتی۔ عیب و ثواب کا پتا نہیں چلتا، گناہ کا قیاس اور احساس نہیں ہوتا۔ آیئے ہم یہ عہد کریں کہ ہم بھی نبی اکرم ﷺ کے فرمان کے مطابق علم حاصل کر کے ترقی و برکت حاصل کریں گے۔ ان شاء اللہ!

(پہلا انعام: 100 روپے کی کتابیں)

ایمانداری کا کرشمہ

محمد شریف خواجہ خیل، کوئٹہ

یہ اس زمانے کی بات ہے جب ہندوستان پر غیاث الدین تغلق کی حکومت تھی۔ سلطنت کا پایہ تخت دہلی تھا۔ دہلی کی ایک بستی میں ایک غریب بیوہ رہتی تھی۔ وہ بے چاری دن رات محنت کرتی، تب جا کر اپنا اور اپنے دو بچوں کا پیٹ پالتی۔ اُس کے بیٹے کا نام حسن تھا اور بیٹی کا نام زینب تھا جو کہ پیدائشی نابینا تھی۔

حسن بڑا ہو کر محنت مزدوری کرنے لگا۔ ایک دن اتفاق سے اُسے کوئی کام نہ ملا اور وہ مایوس ہو کر لوٹ آیا۔ ماں کے قدموں میں سر رکھ کر پھوٹ، پھوٹ کر رونے لگا۔ بوڑھی ماں یہ دیکھ کر تڑپ اٹھی اور بولی "بیٹا رونے سے کیا حاصل، آج تمہیں کام نہ ملا تو کیا ہوا۔ آج بھوکے سو جاتے ہیں، کل خدا کی جو مرضی ہو گی وہ ہی ہو گا"۔

سخت سردی کا موسم تھا۔ آدھی رات کے وقت حسن کی نابینا بہن کی پسلی میں درد اٹھا اور وہ صبح ہونے سے پہلے چل بسی۔ حسن کے دل پر اس بات کا بے حد اثر ہوا اور وہ سخت دل برداشتہ ہوا۔ ان دنوں دہلی میں حضرت خواجہ نظام الدین اولیاؒ کی بڑی شہرت تھی۔ لوگ دور دور سے ان کی خدمت میں حاضر ہوتے تھے۔ حسن نے سوچا کیوں نہ میں بھی حضرت کی خدمت میں حاضری دوں، ممکن ہے خدا میرے حال پر رحم کرے۔ چنانچہ وہ آپؒ کی مجلس میں حاضر ہوا اور بیٹھنے کے بجائے ایک کونے میں جا کھڑا ہوا۔ حضرت نظام الدین اولیاؒ کی نظر جونہی حسن پر پڑی تو نہایت شفقت سے فرمایا: "بادشاہ سلامت بیٹھ جایئے"۔ حسن، حضرت کی زبان سے یہ الفاظ سن کر بے حد حیران ہوا اور ادب و احترام سے بولا۔ "حضور میں ایک غریب اور نادار آدمی ہوں، البتہ آپ دین اور دنیا کے بادشاہ ہیں۔ ہاں اس وقت میں بادشاہوں سے بڑھ کر ہوں کیونکہ آپ کے قدموں میں بیٹھا ہوں"۔ حضرت نظام الدین اولیاؒ نے اپنے خادم سے پوچھا۔ "کھانے کے لیے کچھ ہے"۔ خادم نے جواب دیا۔ "حضرت اس وقت تو کچھ نہیں ہے" آپؒ نے فرمایا "اچھا میری افطاری کا کھانا لے آؤ"۔ خادم کھانا لے آیا تو آپؒ نے روٹی کا ٹکڑا حسن کی طرف بڑھاتے ہوئے کہا۔ "اسے کھا لو' یہ دکن کی بادشاہی کا تاج

ہے"۔ جب حسن کھانا کھا چکا تو آپ نے حسن کو نصیحت کی کہ بیٹا! ہمیشہ دیانتداری سے کام لینا۔

اگلے دن حسن کو ایک نہایت امیر برہمن کے ہاں نوکری مل گئی جس کا دربار میں بڑا اثر و رسوخ تھا۔ ایک دن حسن حسب معمول برہمن کے کھیت میں ہل چلا رہا تھا کہ ہل کسی چیز سے جا ٹکرایا۔ حسن نے وہ جگہ کھودی تو ایک دیگ برآمد ہوئی جو اشرفیوں سے بھری ہوئی تھی۔ اتنی دولت دیکھ کر حسن کی آنکھیں پھٹی کی پھٹی رہ گئیں۔ اس نے سوچا' اس دیگ کو گھر لے جائے اور تمام زندگی سکھ سے بسر کرے مگر حضرت نظام الدین اولیاؒ کی نصیحت فوراً یاد آ گئی۔ چنانچہ حسن دیگ کو برہمن کے پاس لے گیا اور تمام واقعہ کہہ سنایا۔ برہمن حسن کی ایمانداری سے بے حد خوش ہوا اور اگلے روز جب شاہی دربار گیا تو شہزادہ محمد تغلق کو باتوں باتوں میں تمام واقعہ کہہ سنایا۔ شہزادہ بھی متاثر ہوا۔ یوں حسن نے ایمانداری کی بدولت جلد ہی شہزادے کے دل میں جگہ بنالی اور دربار کے امیروں میں شامل ہو گیا۔ اسی طرح دو سال گزر گئے۔ جب سلطان غیاث الدین تغلق کے بعد اس کا بیٹا محمد تغلق تخت نشین ہوا تو حسن اس وقت دکن میں تھا۔ غیاث الدین کی وفات کی خبر سن کر دکن کے امراء نے اتفاق رائے سے حسن کو اپنا بادشاہ چن لیا۔ یوں ایک یتیم لڑکا اپنی ایمانداری بزرگوں کی دعا سے دکن کا حاکم بن گیا۔

(دوسرا انعام: 90 روپے کی کتابیں)

میر کارواں

فریحہ اسلم' فیصل آباد

اللہ جب کسی سے کوئی بڑا کام لینا چاہتا ہے تو اس میں کردار اور عمل کی وہ خوبیاں پیدا کر دیتا ہے جو رہتی دنیا تک انسانیت کی رہنمائی کرتی ہیں۔ بابائے قوم قائداعظم محمد علی جناحؒ کو اللہ نے بہت ساری خوبیوں سے نوازا ہوا تھا۔ ذیل کا واقعہ ان کی پر اعتماد شخصیت کی گواہی دیتا ہے۔ قائداعظمؒ مسلم لیگ کے ایک جلسے میں تقریر کرنے جا رہے تھے کہ ایک کانگریسی طالب علم قائداعظمؒ کی طرف لپکا۔ سب نے اسے روکا مگر قائد نے اسے اشارے سے بلا بھیجا۔ اس نے آتے ہی قائدؒ سے بحث شروع کر دی کہ حصول پاکستان کے لیے مسلم لیگ نے کوئی قربانی نہیں دی اور دیگر ممتاز رہنماؤں کی طرح کبھی جیل نہیں گئے۔ جب کہ عام کانگرسی رہنما بھی کئی بار جیل جا چکے ہیں۔ قائد نے نہایت شفقت سے سمجھایا کہ "جیل جانا عوامی عقیدت کے لیے کوئی معیار نہیں۔ اگر جیل جانا ہی قیادت کا معیار ہوتا تو پھر جرائم پیشہ لوگ جو بار بار جیل جاتے ہیں ان کا شمار عظیم رہنماؤں میں ہوتا۔ میرے بچے! حقیقت اس سے برعکس ہے"۔ چند لمحوں بعد لوگوں کی حیرت کی انتہا نہ رہی جب انہوں نے نوجوان کو والہانہ عقیدت سے قائداعظمؒ کے ہاتھ چومتے ہوئے دیکھا۔ یہ تھے ہمارے عظیم قائد' محمد علی جناحؒ!

(تیسرا انعام: 80 روپے کی کتابیں)

قاتل شوق

محمد راحیل باوانی' حیدر آباد

موسم تبدیل ہو رہا تھا اور دو دن سے مجھے کھانسی اور بخار تھا۔ میں ابو کے ساتھ دوائی لینے میمن اسپتال گیا۔ ڈاکٹر سے دوائی لکھوانے کے بعد جب میں باہر نکلنے کے لیے گیٹ کے پاس پہنچا تو میں نے وہاں ایک بڑا ہجوم دیکھا۔ دفعتاً میرے قدم رک سے گئے جب ایک عورت کو میں نے پتنگ اڑانے والوں اور بنانے والوں کو بددعا دیتے سنا۔

ہجوم مشتعل ہو رہا تھا اور عورت کے ساتھ دو بچیاں بھی تھیں جو رو رہی تھیں۔ پہلی منزل پر آپریشن تھیٹر تھا جہاں سب کی نظریں لگی ہوئی تھیں۔ کچھ دیر بعد ہی لوگ سفید کپڑوں میں ایک بچے کی لاش لے کر نکلے تو عورت اور بچیوں کے ساتھ وہاں موجود کئی مرد حضرات بھی اپنے آنسو ضبط نہ کر سکے۔

میں نے جب اوپر کی جانب نظر دوڑائی تو مجھے آپریشن تھیٹر سے آنٹی فریدہ آتی نظر آئیں۔ وہ یہاں پر لیڈی ڈاکٹر کے فرائض انجام دے رہی ہیں۔ آنٹی نے بتایا کہ جب بچے اور بڑے سڑک پر کھڑے ہو کر پتنگ بازی کا شوق پورا کریں تو اس سے نہ صرف وقت اور پیسہ برباد ہوتا ہے بلکہ انسانی جان کو بھی خطرہ لاحق ہوتا ہے۔

"وہ کیسے؟" میں نے نہ سمجھتے ہوئے پوچھا۔

"اس کی مثال یہ بچہ تھا۔ ایک ننھی سی کلی اس شوق کی خاطر جان سے ہاتھ دھو بیٹھی یہ بچہ پتنگ بازی کی وجہ سے مر گیا"

دو سال کا یہ معصوم بچہ جو بے حد خوبصورت تھا آج شام کو اپنے ابو کے ساتھ موٹر سائیکل پر جا رہا تھا کہ پتنگ کی ڈور بچے کی

گردن میں لپٹ گئی۔ گاڑی کی رفتار تیز تھی' اس لیے ڈور بھی گھسٹتی ہوئی ساتھ گئی اور بچے کی گردن کٹتی چلی گئی۔ "اس فضول شوق کی خاطر ایک ننھی کلی کھلنے سے پہلے ہی مرجھا گئی۔

یہ کہہ کر آنٹی فریدہ اپنے گھر کو چلی گئیں اور میں سوچنے لگا کہ بچے اور بڑے اب بھی اس قاتل شوق سے تفریح کے نام پر وقت اور پیسہ برباد کر رہے ہیں۔ ہم کب تک یونہی انسانی جانوروں سے کھیلتے رہیں گے؟ (چوتھا انعام: 70 روپے کی کتابیں)

سلطان کا وعدہ

شاہ فاروق شور کوٹ

بوڑھا بھرے دربار میں داخل ہوا اور بے دھڑک سلطان کے سامنے جا کر اپنا قرض مانگنے لگا۔ سلطان کے ماتھے پر شکن تک نہ آئی۔ وہ بولا "کہو بابا کیا بات ہے"۔

"سلطان معظم! میں آپ سے قرض وصول کرنے آیا ہوں"۔ بوڑھے نے کہا۔ "ہم کس طرح تمہارے مقروض ہیں؟" سلطان نے پوچھا۔

بوڑھا بولا: "حضور سرنگا پٹم کی پہاڑیوں کے قریب جنگل میں میری جھونپڑی ہے۔ جب آپ ولی عہد تھے اُس وقت آپ میری جھونپڑی کی طرف آئے تھے اور پانی مانگا تھا۔ میں نے آپ کی خدمت میں اناروں کا شربت پیش کیا تھا۔ آپ نے کہا تھا کہ بابا تم محل میں آکر اپنا انعام وصول کر لینا۔ تمہارا انعام مجھ پر قرض ہے"۔

یہ سن کر سلطان نے کہا "بابا مجھے یاد آگیا۔ سلطان اپنے وعدوں سے نہیں پھرا کرتے۔ بولو کیا مانگتے ہو؟"۔ "سلطان معظم میں آپ کی آدھی سلطنت چاہتا ہوں"۔ بوڑھے نے کہا۔ سارا دربار سناٹے میں آگیا۔ سلطان کچھ دیر سوچنے کے بعد بولا "بابا ہم تمہاری خواہش پوری کرنے کے لیے تیار ہیں"۔ بوڑھا اور درباری یہ سن کر حیران رہ گئے۔ بوڑھا بولا۔ "بے شک آپ قول کے سچے ہیں۔ میں اپنی خواہش واپس لیتا ہوں اور التجا کرتا ہوں کہ مجھے صرف پانی کا ایک سادہ پیالہ عطا کیا جائے تاکہ قرضے کی وصولی کی شرط پوری ہو سکے۔ بوڑھے کی یہ خواہش پوری کر دی گئی اور سلطان نے حکم دیا کہ بوڑھے کی جھونپڑی کے اردگرد کی وسیع رقبے کو اناروں کے باغ میں تبدیل کر دیا جائے۔ یہ وعدے کے پابند بادشاہ سلطان ٹیپو تھے جن کی بہادری اور انصاف شہرہ آفاق ہے۔ (پانچواں انعام: 60 روپے کی کتابیں)

کہنا بڑوں کا مانو

طاہر علی' لاہور

ایک بلی کے تین بچے تھے۔ ان میں سے سب سے بڑے بچے کا نام "منکو" مجھلے کا نام "سنکو" اور سب سے چھوٹے بچے کا نام "منکو" تھا۔ منکو بہت شریر تھا۔ وہ باہر جا کر گلہری کے بچے کے ساتھ کھیلا کرتا تھا۔ اس کی ماں اسے سمجھاتی تھی کہ تم گھر میں اپنے بھائیوں کے ساتھ کھیلا کرو۔ لیکن منکو کسی کی ایک نہ سنتا تھا۔ ایک دن منکو گلہری کے بچے کے ساتھ کھیل رہا تھا کہ اسے ایک کتا اٹھا لے گیا۔ کافی دیر کے بعد جب منکو گھر نہ آیا تو بلی بہت پریشان ہوئی۔ وہ گلہری کے بچے کے پاس گئی اور اس سے پوچھا کہ منکو کہاں ہے؟ اس نے کہا کہ خالہ جان! اسے تو کتا چچا اٹھا کر لے گیا ہے۔ بلی دوڑتی ہوئی کتے کے پاس پہنچی اور اس سے کہا کہ میرا بچہ واپس کر دو۔ کتے نے کہا مجھے بھوک لگی ہوئی ہے۔ مجھے دودھ لا دو گی تو پھر تمہارے بچے کو چھوڑ دوں گا۔ بلی دوڑتی ہوئی گائے کے پاس گئی اور کہا: بڑی بی! مجھے دودھ دے دو۔ گائے نے کہا میں کئی دن سے سوکھی گھاس کھا رہی ہوں اگر مجھے سبز گھاس لا دو گی تو میں تمہیں دودھ دے دوں گی۔ بلی بھاگم بھاگ کسان کے پاس گئی اور کہا کسان بھیا! مجھے سبز گھاس دے دو۔ کسان نے کہا کئی دن سے بارش نہیں ہوئی۔ تم اللہ سے دعا کرو کہ بارش ہو جائے۔ بلی نے گھر جا کر اللہ سے بارش کی دعا کی۔ اللہ نے اس کی دعا قبول کی اور اسی دن بارش ہو گئی۔ کسان نے خوش ہو کر بلی کو ڈھیر ساری گھاس دے دی بلی نے جا کر گھاس گائے کو دی۔ گائے نے بلی کو دودھ دے دیا۔ بلی دودھ لے کر کتے کے پاس گئی۔ کتے نے دودھ پی کر بلی کو اس کا بچہ واپس کر دیا اور پھر منکو نے اپنی ماں اور بھائیوں سے معافی مانگی اور وعدہ کیا کہ وہ آئندہ گھر میں اپنے بھائیوں کے ساتھ کھیلا کرے گا۔ پیارے بچو! ہمیں بھی اپنے بڑوں کا کہنا ماننا چاہیے ورنہ ہم بھی منکو کی طرح کئی مصیبتوں کا شکار ہو سکتے ہیں۔

(چھٹا انعام: 50 روپے کی کتابیں)

☆☆☆

ایم اے، سی ایس ایس۔ ممتاز شاعر اور ادیب۔ کئی کتابوں کے مصنف ہیں۔ ان کی نظمیں بچوں کے ادب کے حوالے سے نہایت قابل قدر مقام رکھتی ہیں۔

صحت

کرامت بخاری

مولی گاجر پالک پتے
گوبھی اور چقندر
کدو اور کریلے کھائیں
کھیرے اور ٹماٹر
مٹر، مونگ اور دالیں، دلیہ
بینگن، بھنڈی توری
مرغی اور کڑھی کم کم
تھوڑا حلوہ پوری
بیماری کمزوری کا ہے
بچو ایک ہی حل
انڈے دودھ ملائی کھائیں
اور موسم کے پھل !

علی اکمل تصور

قصور میں مقیم نوجوان قلمکار جن کی تخلیق کردہ کہانیاں بچوں میں بے حد مقبول ہیں۔ اس ماہ کی کہانی بھی آپ سب کے لیے دلچسپی اور ایک فکر انگیز پیغام کی حامل ہے۔

چڑی مار

"فینسی برڈ شاپ" شہر کی ایک مشہور دوکان تھی۔ یہاں پر جانوروں اور پرندوں کی خرید و فروخت کا کام ہوتا تھا۔ دوکان کے مالک کا نام منور علی تھا۔ بوڑھا ہونے کے باوجود اس کی صحت قابل رشک تھی۔ اس وقت وہ اپنے کیبن میں بے چینی سے کسی کا منتظر تھا۔ وہ بار بار گھڑی کی سوئیوں کی طرف دیکھتا تھا اور منہ ہی منہ میں کچھ بڑ بڑا بھی رہا تھا۔ اتنے میں کھٹکا ہوا اور منور علی کا ملازم کیبن میں داخل ہوا۔

"جناب شوکی چڑی مار آگیا ہے......"

"اسے جلدی سے میرے پاس لے آؤ......" منور علی کی بات سن کر ملازم واپس چلا گیا۔ تھوڑی دیر کے بعد ایک جوان آدمی کیبن میں داخل ہوا۔ اُس کے چہرے پر نوک دار بڑی بڑی مونچھیں تھیں۔

"تم نے بہت دیر لگا دی شوکی!...... تم سے ایک کام ہے اور مجھے یقین ہے کہ یہ کام تم ہی کر سکتے ہو"۔ منور علی نے خاص انداز میں کہا۔

"کیا کام...... کچھ مجھے بھی تو علم ہو......"۔

"مجھے ایک بچے کی ضرورت ہے......" اس سے پہلے کہ منور علی بات مکمل کرتا شوکی جلدی سے بول پڑا:

"جناب مجھے اس کام کا تجربہ نہیں ہے۔ میں نے آج تک بچے نہیں اٹھائے' میں تو شکاری ہوں۔ کوئی جانور پکڑنا ہو تو بتایئے۔ ورنہ میں چلتا ہوں"۔

منور علی کا دماغ گھوم گیا تھا۔ وہ غصے سے بولا: "احمق آدمی پوری بات تو سنو...... مجھے بندریا کے بچے کی ضرورت ہے۔ یہ کام مشکل ضرور ہے۔ لیکن مجھے یقین ہے کہ تم کر لو گے......" منور علی کی بات سن کر شوکی سوچ میں پڑ گیا۔

"کام مشکل تو ہے لیکن ہو جائے گا" شوکی کا جواب سن کر منور علی خوش ہو گیا۔ اُس نے شوکی کو ایک ہزار روپیہ ایڈوانس کے طور پر دیا۔ پیسے لے کر شوکی دکان میں سے باہر نکل آیا۔ اسے اگلی صبح روانہ ہونا تھا اور ابھی تیاری بھی کرنا تھی۔ اب وہ گھر کی طرف تیز تیز قدم اٹھا رہا تھا۔ پھر جیسے ہی وہ گلی کے موڑ پر پہنچا اس کے اٹھتے قدم رک گئے۔ سامنے سے تیمور آرہا تھا۔ تیمور اس کا بچپن کا دوست تھا۔ لیکن اُسے دیکھتے ہی شوکی بیزار سا ہو گیا۔

"اپنا شوکی آگیا۔ شوکی چڑی مار...... واہ کیا نام ہے۔ یار ایک آدھ چڑیا مجھے بھی لا دو۔ لیکن زندہ...... مردہ نہیں"۔ تیمور کی باتیں سن کر شوکی کو غصہ تو بہت آیا لیکن برداشت کر گیا۔ وہ کس کس سے لڑتا۔ سب ہی تو اُسے شوکی چڑی مار کہہ کر مخاطب کرتے تھے۔ یہ نام اُسے وراثت میں ملا تھا۔ اس کا باپ بھی شکاری تھا۔ جانوروں کو پکڑنے کا ہنر اُس نے اپنے باپ سے سیکھا تھا۔

اُس کے باپ کا نام سلامت تھا۔ سب لوگ اُسے سلامی چڑی مار کہہ کر پکارتے تھے۔ باپ کی وفات کے بعد جب شوکی نے جانوروں کو پکڑنے کا کام شروع کیا تو لوگ اُسے شوکی چڑی مار کہنے لگے۔ شوکی کو اس نام سے چڑ تھی۔ جب کوئی اُسے شوکی چڑی مار کہتا تھا تو وہ آپے سے باہر ہو جاتا تھا۔ لیکن وہ مجبور تھا۔ اُسے رنجیدہ دیکھ کر اس کی والدہ اکثر اُس سے کہتی تھی:

"میرے بچے یہ کام مت کرو۔ یہ ظلم ہے۔ تم روپوں کے لالچ میں آزاد پرندوں کو غلام بنا لیتے ہو۔ ان سے ان کی پیدائشی آزادی کا حق چھین لیتے ہو۔ یہ گناہ ہے......" اور شوکی ہر بار ایک ہی جواب دیتا تھا۔ "امی یہ کام ہماری روزی روٹی کا ذریعہ ہے۔ اس لیے گناہ نہیں ہے۔ بس ایک الجھن ہے۔ لوگ مجھے چڑی مار کہنے لگے ہیں"۔

"تم یہ کام چھوڑ دو گے تو لوگ تمہیں تمہارے اصلی نام سے پکارنے لگیں گے۔ تم کوئی دوسرا ہنر سیکھ لو۔ بیٹے دنیا میں اتنے لوگ ہیں وہ بھی تو روزی کماتے ہیں"۔ اس کی ماں سرد آہ بھر کر رہ جاتی تھی۔ وہ بے چاری اب ضعیف ہو چکی تھی۔ اس کی نظر بھی کمزور ہو چکی تھی۔ وہ ساری رات کھانستی رہتی تھی۔ اُسے ٹی بی تھی۔ سرکاری ہسپتال میں اس کا علاج ہو رہا تھا۔ شوکی کوئی زیادہ امیر آدمی نہیں تھا۔ اُس کے باپ نے ایک نیم پختہ مکان اور ایک کھٹارہ سی وین ورثہ میں چھوڑی تھی۔ یہ اُس کی ساری زندگی کی کمائی تھی اور اب شوکی اسی وین پر جانوروں کو پکڑنے کے لیے جاتا تھا۔

اگلے دن شوکی جنگل کی طرف روانہ ہوا۔ رات گئے جنگل پہنچا۔ وہ رات اُس نے اپنی وین میں گزاری اور پھر اگلے دن سورج کی پہلی کرن کے ساتھ ہی وہ جنگل میں داخل ہوا۔ ٹھنڈی ٹھنڈی ہوا چل رہی تھی۔ چڑیوں کی مسحور کن چہچہاہٹ اُس کے کانوں سے ٹکرا رہی تھی۔ لیکن وہ سنگ دل تھا۔ اس کی بے چین نظریں تو اپنا شکار ڈھونڈ رہی تھیں۔ لیکن جانے کیا بات تھی۔ درختوں کی شاخیں ویران پڑی تھیں۔ وہ جنگل میں کافی دور نکل گیا پھر یکدم اُس کے اٹھتے قدم رک گئے۔ اس نے پیپل کے گھنے درخت پر بندروں کا غول دیکھ لیا تھا۔ اس غول میں ہر عمر کا بندر موجود تھا۔ چند بچے بھی تھے جو اپنی اپنی ماؤں کے ساتھ چمٹے ہوئے تھے۔ اب شوکی نے اپنے کام کا آغاز کیا۔ وہ اپنے ساتھ لوہے کی مضبوط تاروں سے بنا ہوا بڑا سا پنجرہ لایا تھا۔ شوکی نے نوک دار ہک میں مکئی کا بھٹا پرو دیا تھا۔ جیسے ہی بندر بھٹا کھینچتا پنجرے کا دروازہ بند ہو جاتا تھا۔ شوکی نے درخت کے نیچے صاف سی جگہ پر پنجرہ رکھ دیا اور پھر پیچھے ہٹ گیا۔ اب وہ بہت دور کھڑا اپنی کامیابی کا منتظر تھا۔ بندر درخت کی شاخوں پر جھول رہے تھے۔ شرارتیں کر رہے تھے۔ ایسے میں ایک بندر گھاس پر گر پڑا اور تیزی سے پنجرے کی طرف آیا۔ شوکی گھبرا گیا۔ اُسے تو بندریا کے بچے کی ضرورت تھی۔ اُس بندر نے پنجرے کے گرد چکر لگایا اور پھر کھی ...... کھی کرتا واپس لوٹ گیا۔ جوان بندر بڑا ہوشیار ہوتا ہے۔ اُسے دھوکا دینا آسان کام نہیں ہوتا۔ اب تمام بندر زمین پر اتر آئے۔ ایسے میں بندریا کا ایک بچہ پنجرے کی طرف بڑھا۔ اُس کی ماں نے دانت نکال کر کھی...... کھی...... کھی کی آواز نکالی اور بچہ واپس لوٹ گیا۔ شوکی سٹپٹا کر رہ گیا۔ بچے کی نظر پنجرے میں موجود مکئی کے بھٹے پر جمی ہوئی تھی۔ اُس کے دل میں لالچ پیدا ہو چکا تھا۔ پھر نظریں بچا کر وہ پنجرے کی طرف بڑھا۔ پنجرے کے قریب پہنچ کر اُس نے پلٹ کر اپنی ماں کی طرف دیکھا۔ وہ گھاس پر لوٹ پوٹ ہو رہی تھی۔ بندریا کا بچہ پنجرے کے چھوٹے سے دروازے کی طرف بڑھا۔ وہ معصوم خطرے سے بے خبر تھا۔ وہ پنجرے میں داخل ہو گیا۔ اتنے میں اُس کی ماں نے اُسے دیکھ لیا۔ وہ دور سے چیخی۔ بچہ گھبرا گیا۔ اُس نے بھٹے کو دبوچ کر اپنی طرف کھینچا اور پھر کھٹاک کی آواز کے ساتھ دروازہ بند گیا۔ شوکی خوشی سے اچھل پڑا۔ بندریا کا بچہ اب پنجرے میں سے نکلنے کی کوشش کر رہا تھا۔ یوں محسوس ہوتا تھا کہ جیسے وہ کہہ رہا ہو:

"میری مدد کرو...... میری مدد کرو......" بندروں کے غول نے پنجرے کے گرد گھیرا ڈال دیا۔ سب ہی زور لگا رہے تھے۔ لیکن پنجرے کی سلاخیں بہت مضبوط تھیں۔ ایسے میں شوکی آگے بڑھا۔ اُس کے پاس دو نالی بندوق تھی۔ قریب پہنچ کر اُس نے ہوا میں فائر کیا۔ دھماکے کی آواز فضا میں گونجی اور تمام بندر خوف زدہ ہو کر بھاگ گئے۔ بندریا کا بچہ سہم کر رہ گیا۔ شوکی نے بندوق

کندھے سے لٹکائی اور پنجرہ اٹھا لیا۔ اب وہ اپنی وین کی طرف قدم اٹھا رہا تھا۔ جنگل کی فضا خاموش تھی۔ ایسے میں شوکی کو اپنے عقب میں سر سراہٹ سی محسوس ہوئی۔ لیکن شوکی اسے اپنا وہم سمجھ رہا تھا۔ جلد ہی شوکی اپنی وین کے قریب پہنچ گیا۔ اُس نے وین میں پنجرہ رکھا اور اپنی سیٹ پر آبیٹھا۔ لیکن اس سے پہلے کہ وہ انجن سٹارٹ کرتا۔ "دھپ" کی آواز اس کے کانوں سے ٹکرائی۔ اس نے پلٹ کر دیکھا اور پھر حیرت زدہ رہ گیا۔ پنجرے میں قید بچے کی ماں گاڑی میں موجود تھی۔ وہ پنجرے کی سلاخوں سے سر لگائے بیٹھی تھی اور حسرت بھری نظروں سے اپنے بچے کی طرف دیکھ رہی تھی۔ شوکی نے بندریا کو ڈرانے کی کوشش کی۔ "ہش...... ہش" لیکن بندریا اپنی جگہ سے ہٹی نہیں بلکہ وہ دانت نکال کر غرانے لگی۔ شوکی نے اپنی بندوق میں کارتوس بھرا اور ہوائی فائر کیا۔ دھماکے کی آواز فضا میں گونجی۔ لیکن بندریا اب بھی اپنی جگہ پر ڈٹی ہوئی تھی۔

"عجیب مصیبت ہے" شوکی کو غصہ آگیا۔ لیکن ساتھ ہی کچھ سوچ کر ہنس دیا: "میں بھی بے وقوف ہوں۔ بندریا کو بھی ساتھ لیے چلتا ہوں۔ اسے چڑیا گھر والوں کو بیچ دوں گا۔ دوگنا منافع ہوگا"۔ یہ سوچ کر شوکی نے وین شہر کی طرف بڑھا دی۔ مظلوم بندریا اپنے بچے کے پاس سر جھکائے بیٹھی تھی۔ یہ محبت ہے۔ انسان ہو یا جانور دونوں کی فطرت میں محبت کا جذبہ یکساں موجود ہوتا ہے۔ بندریا نے اپنے بچے کی محبت کو اپنی آزادی پر ترجیح دی تھی اور شوکی کے دل میں ایک لمحے کے لیے بھی اُن دونوں کے لیے ہمدردی کا جذبہ پیدا نہیں ہوا تھا۔

شوکی کا سفر جاری تھا کہ رات ہو گئی۔ وہ رات شوکی نے سڑک کے کنارے موجود ایک ریستوران میں گزار دی۔ اگلے دن شوکی اپنے گھر پہنچا تو حیرت زدہ رہ گیا۔ گھر کے دروازے پر تالا لگا ہوا تھا۔

"امی کہاں گئی......" اُس نے سوچا۔ اُس کے پاس تالے کی دوسری چابی موجود تھی۔ اُس نے تالا کھولا اور وین کو صحن میں کھڑا کر دیا۔ پھر اُس نے بندریا اور اُس کے بچے کو خوراک دی اور کمرے میں چلا آیا۔ اب وہ اپنی امی کا منتظر تھا۔ ایک گھنٹہ گزر گیا۔ لیکن اُس کی امی واپس نہیں لوٹی۔ پھر بے چین ہو کر وہ گھر میں سے باہر نکل آیا۔ اب وہ اپنے پڑوسیوں سے اپنی امی کے متعلق پوچھنے لگا۔ لیکن سب ہی لاعلم تھے۔ ہر گزرتے لمحے کے ساتھ شوکی کی فکر میں اضافہ ہوتا چلا جا رہا تھا۔ الجھنوں نے شوکی کو اپنے حصار میں لے لیا تھا۔ باہر بندریا کا بچہ چیخ رہا تھا۔ وہ پنجرے کی سلاخوں کے ساتھ ٹکریں مار رہا تھا۔ شوکی نے باہر نکل کر دیکھا۔ بندریا سلاخوں کو توڑنے کی کوشش کر رہی تھی۔ کبھی اپنے نوکیلے دانت آزماتی تھی۔ لیکن اُس کی ہر کوشش بے کار ثابت ہوتی تھی۔ شوکی نے غور سے دیکھا اور پھر اس کا دل دہل کر رہ گیا۔ بندریا کی آنکھوں سے آنسو بہہ رہے تھے۔ پہلی بار شوکی کے دل پر دھچکا لگا تھا۔ اُسے اپنی ماں کی گم شدگی کا غم تڑپا رہا تھا۔ وہ بے زبان بندریا

بھی تو ایک ماں ہی تھی۔ اتنے میں دروازے پر دستک ہوئی شوکی بھاگ کر گیا۔ دوسری طرف اُس کی ماں کھڑی تھی۔ اپنی ماں کو سلامت دیکھ کر پہلے تو وہ خوش ہوا پھر اپنی ماں سے لپٹ کر بچوں کی طرح پھوٹ پھوٹ کر رونے لگا۔

"ماں تو کہاں تھی......" شوکی پوچھ رہا تھا۔

"شوکی بیٹا میں ہسپتال گئی تھی۔ ڈاکٹر نے میرا ایکسرے لیا ہے۔ ہسپتال سے واپسی پر مجھ سے غلطی ہو گئی۔ تم تو جانتے ہو بس سٹاپ پر تمام بسیں ایک جیسی آتی ہیں۔ میں ایک ایسی بس پر سوار ہو گئی جو ہمارے گھر کی طرف نہیں آتی تھی۔ وہ بس مجھے جانے کہاں لے گئی۔ میرے پاس روپے بھی ختم ہو گئے تھے۔ پھر ایک نیک لڑکے نے میری مدد کی۔ اُس نے مجھے ہمارے گھر کی طرف آنے والی بس پر سوار کرایا۔ کرایہ بھی دیا اور کنڈیکٹر کو بھی ہدایت کی۔ آج میں نے اپنی کمزور نظر کے باعث بہت دھکے کھائے ہیں"۔

"امی میں کل ہی آپ کو نظر کی عینک لگوانے کے لیے ڈاکٹر کے پاس لے چلوں گا"۔ شوکی نے کہا۔ اتنے میں شوکی کی امی کو کھی...... کھی کی آواز سنائی دی۔

"آج کسے پکڑ لائے ہو" شوکی کی امی پنجرے میں قید بچے اور بندریا کو دیکھ کر ساری بات سمجھ گئی۔

"شوکی شرم کرو' روپے کے لالچ میں تم نے ظلم کی انتہا کر دی ہے"۔ "تم ایک ماں کو اس کے بچے سے علیحدہ کر رہے ہو۔ ذرا سوچو آج اگر میں واپس نہ لوٹتی کوئی حادثہ ہو جاتا تو تم پر کیا گزرتی۔ ایسی ہی قیامت اُس ماں پر گزر رہی ہے جس کے بچے کو تم نے قید کر رکھا ہے۔ افسوس تم بہت ہی ظالم ہو"۔ شوکی کی امی جانے کیا کیا کہتی رہی اور شوکی سر جھکائے سنتا رہا۔

اگلے دن شوکی کی ماں بڑی خاموش تھی۔ شوکی نے بات کرنے کی کوشش کی لیکن اُس کی امی نے کوئی جواب نہ دیا۔ شوکی اپنی وین کی طرف بڑھا اور بولا: "ماں میں جا رہا ہوں"۔ شوکی کی امی اب بھی خاموش تھی کیونکہ وہ جانتی تھی کہ شوکی بندریا اور اس کے بچے کو فروخت کرنے جا رہا ہے۔ شوکی کی ماں کا دل بجھا ہوا تھا۔

"ماں آج مجھے دیر ہو جائے گی۔ کیوں کہ میں بندریا اور بچے کو واپس جنگل میں چھوڑنے جا رہا ہوں"

شوکی کی یہ بات سن کر اُس کی ماں کے چہرے پر مسکراہٹ پھیل گئی۔ اُس نے دل ہی دل میں اللہ کا شکر ادا کیا جس نے اُس کے گمراہ بیٹے کو ہدایت دی تھی۔

جنگل سے واپس لوٹنے کے بعد شوکی نے اپنی وین بیچ دی اور اس رقم سے اس نے محلے میں ہی جنرل اسٹور کھول لیا۔ کام اچھا چل پڑا تھا۔ اس دن شوکی اپنی دکان پر بیٹھا تھا کہ تیمور آگیا۔ تیمور ہمیشہ اُسے شوکی چڑی مار کہہ کر پکارتا تھا۔ تیمور کو دیکھ کر شوکی کا منہ بن گیا۔

"شوکت بھائی ایک کلو چینی دینا......" تیمور نے کہا۔ شوکی پہلے تو حیران ہوا پھر خوش ہو گیا۔ آج بہت دنوں کے بعد کسی نے اسے اُس کے اصل نام سے پکارا تھا اور آج اسے ایک برے نام سے نجات مل گئی تھی۔ ...... واقعی اللہ کا دوست وہ ہوتا ہے جو اس کی مخلوق پر رحم کرتا ہے۔ عزت اور ذلت اللہ کے اختیار میں ہے۔ جو مظلوموں پر ظلم کرتا ہے ذلالت اس کا مقدر بن جاتی ہے اور جو اللہ کی مخلوق سے محبت کرتا ہے اللہ کی پاک ذات اس سے محبت کرنے لگتی ہے اور ...... جسے یہ محبت حاصل ہو جائے اس خوش نصیب کی سب ہی عزت کرتے ہیں۔

☆☆☆

لو آئی گرمی!

1 رابعہ خاتون، ایبٹ آباد (پہلا انعام: 100 روپے کی کتابیں)

2 عائشہ جاوید، نچوال کینٹ (دوسرا انعام: 75 روپے کی کتابیں)

3 نعمان فیصل، پشاور (تیسرا انعام: 50 روپے کی کتابیں)

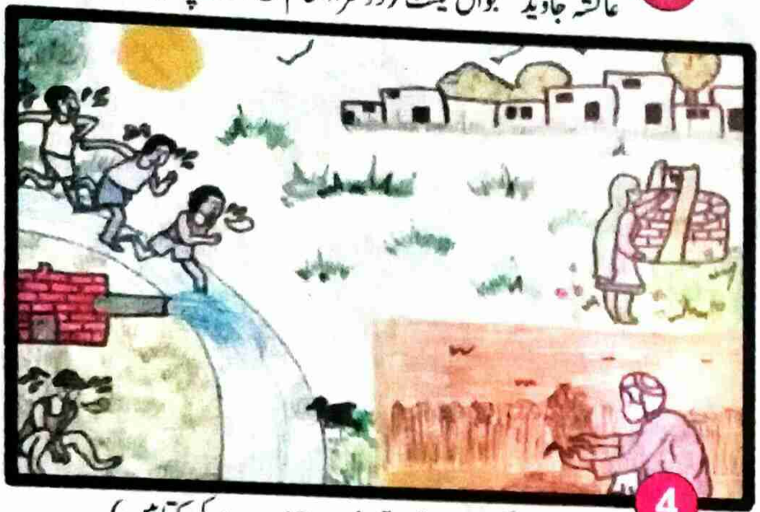

4 حبیبہ خالد، کھاریاں (چوتھا انعام: 45 روپے کی کتابیں)

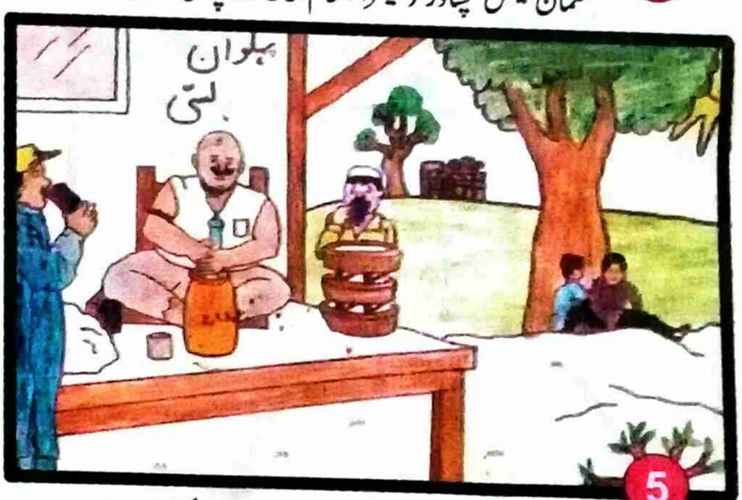

5 محسن رحمان، بہاولپور (پانچواں انعام: 40 روپے کی کتابیں)

6 محمد شہباز علی، لاہور (چھٹا انعام: 35 روپے کی کتابیں)

ان ہونہار مصوروں کی تصویریں بھی اچھی ہیں:۔ سرمد عرفان احمد سیالکوٹ۔ فریال علی پشاور۔ محمد سمیر عاصم کراچی۔ حبیبہ ساجد سکھر۔ فریحہ رضوان واہ کینٹ۔ اقصیٰ محمود کراچی۔ ذیشان علی لاہور۔ ماہ رخ میر گوجرانوالا۔ قیصر شہزاد لالہ موسیٰ۔ محمد فیصل یاسین کراچی۔ شگفتہ رباب ملکوال۔ محمد شہاب راولپنڈی۔ عافیہ حیدر میرپور آزاد کشمیر۔ محمد معاذ عارف لاہور۔ اسد محمود لاہور۔ توقیر علی فیصل آباد۔ نعیم گوہر ملتان۔ محمد صادق لاہور۔ اقراء جاوید قصور۔ سعد علی کوہاٹ۔ اسد خان پشاور۔ نوازش علی بنوں۔ حیدر عباس ملتان۔ انعم قیصر حیدر آباد۔ فضہ علی کراچی۔ رعنا بتول شاہ کوٹ۔ افضال احمد کوئٹہ۔ قلب حسین لاہور۔ اویس خان کراچی۔

جولائی کا موضوع: دریا کی سیر — آخری تاریخ 10 جون

اگست کا موضوع: برسات — آخری تاریخ 10 جولائی

ہدایات: تصویر 6 انچ چوڑی، 9 انچ لمبی اور رنگین ہو۔ تصویر کی پشت میں مصور پنا نام، عمر، کلاس، اور پورا پتا لکھے اور اسکول کے پرنسپل یا ہیڈ مسٹریس سے تصدیق کروائے کہ تصویر اسی نے بنائی ہے۔

ذرا کِھلکھلائیے تو!

جناب 'ٹرانسپورٹ کی کمی کیسے دور ہو؟
اب یہی دیکھئے یہ بس ٹائر' باڈی اور انجن نہ
ہونے کی وجہ سے یونہی بیکار کھڑی ہے!

سایۂ پدری!

جو کرتے ہیں دنیا میں محنت زیادہ

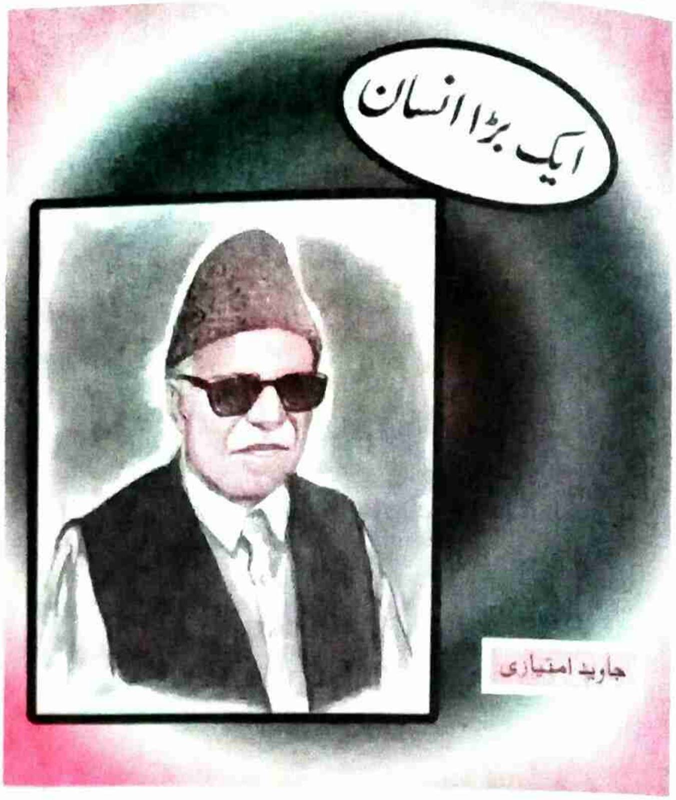

"بیٹے! نماز خلوص اور محبت کے ساتھ اس طرح پڑھو کہ گویا تمہیں نماز ہی کے لیے پیدا کیا گیا ہے"۔ یہ سن کر میں چونک سا گیا۔ نماز کے بارے میں اس قدر خوبصورت بات میں نے پہلے کسی سے نہیں سنی تھی۔ نماز جیسا فریضہ اگر ایسی عقیدت اور ایسے ایمان و یقین کے ساتھ ادا کیا جائے تو اس سے زیادہ قابل رشک بات کیا ہو سکتی ہے۔ آپ کا دل یقیناً جھوم جھوم گیا ہو گا اور آپ جاننا چاہتے ہوں گے کہ ایسی اچھی بات کہنے والی شخصیت آخر کون ہو سکتی ہے؟ اچھے بچو! یہ تھے سید نظر زیدی' نامور شاعر' ممتاز ادیب اور ہمہ صفت زندہ و تابندہ کردار کا حامل ایک بڑا انسان!

سید نظر زیدی آج سے تقریباً 88 سال پیشتر 1915ء میں موضع کلھیڑی' ضلع بجنور (بھارت) میں پیدا ہوئے۔ والد ایک علم پرور' سادہ منش اور متقی و پرہیز گار شخصیت کے مالک تھے۔ آپ نے ابتدائی تعلیم گھر پر حاصل کی۔ ایک عرصہ تک مدرسے میں بھی پڑھائی کرتے رہے تاہم انہوں نے ایک دفعہ خود یہ انکشاف کیا تھا کہ: میں باقاعدہ طور پر ہائی اسکول یا کالج کی مروجہ تعلیم تو حاصل نہ کر سکا البتہ اپنے شوق اور لگن کی وجہ سے مشکل سے مشکل حالات میں بھی میں نے تعلیم کا سلسلہ جاری رکھا۔

کتاب سے دوستی بچپن ہی میں استوار ہو چکی تھی۔ چنانچہ لکھنے لکھانے اور شعر کہنے کا ملکہ وقت کے ساتھ ساتھ پروان چڑھتا رہا۔ 1931ء میں آپ لاہور آگئے۔ لاہور صدیوں سے علم و فن کا مرکز چلا آرہا ہے۔ شاید یہی کشش آپ کو یہاں کھینچ لائی۔

سید نظر زیدی پڑھنے لکھنے کے دھنی اور قلم کے مزدور تھے اور پھر یہی آپ کا ذریعہ معاش ٹھہرا۔ لاہور کی فضا نے حسب روایت اگرچہ انہیں آزمائشوں کی کسوٹی پر خوب ٹھونک بجا کر پرکھا تاہم مسلسل محنت اور جدوجہد کی کنجی سے آخر کار فتح مندی کے دروازے کھلتے چلے گئے۔

سید نظر زیدی نے بہت سے رسالوں کی ادارت سنبھالی اور انہیں اپنی لگاتار محنت سے بام عروج تک پہنچایا۔ ان ساری مصروفیات کے بین بین آپ نے تصنیف و تالیف کا کام برابر جاری رکھا۔ کہانیاں لکھیں' ناول اور افسانے لکھے' تاریخ و سوانح کی قابل قدر داستانیں رقم کیں۔ ڈرامے بھی لکھے اور خوبصورت شاعری بھی کی۔

بچوں کے لیے آپ نے بہت کام کیا ہے۔ آپ کی لکھی ہوئی مزے مزے کی اصلاحی کہانیاں اور نظمیں بچوں میں بہت مقبول ہوئیں۔ ریڈیو پر اکثر نشر ہونے والا آپ کا دلپذیر ترانہ: "پیارے پاکستان اونچی تیری شان" آج بھی کانوں میں رس گھولتا محسوس ہوتا ہے۔

آپ کی علمی و ادبی خدمات کے اعتراف میں حکومت پاکستان نے آپ کو سندِ امتیاز عطا کی۔ نیشنل بک فاؤنڈیشن کی طرف سے بھی آپ نے صدارتی ایوارڈ حاصل کیا تھا۔

خوش خیال' خوش اطوار' طبیعت کے سادہ' ہنس مکھ' محنتی' ملنسار اور منکسر مزاج' ایک سو سے زائد کتابوں کے مصنف جو تمام عمر نام و نمود اور شہرت سے یکسر بے نیاز رہ کر لکھنے پڑھنے اور دوسروں کے دکھ درد بانٹنے میں مصروف رہے۔ ...... بچو! یہ تھے ہمارے اور آپ سب کے سید نظر زیدی' جو آخر کار ایک بھرپور اور قابل رشک زندگی گزار کر 21 جون 2002ء کو ہم سے ہمیشہ کے لیے جدا ہو گئے۔

ممتاز شاعر، ادیب اور ماہر تعلیم۔ گورنمنٹ اسلامیہ کالج لاہور سے وائس پرنسپل کے عہدہ پر فائز رہے۔ آپ کی تحریریں بچوں کے لیے خاص طور پر دلچسپی کا باعث ہوتی ہیں۔ ان کی متعدد کتابیں داد و تحسین حاصل کر چکی ہیں۔

جیک اور دھوکے باز دیو

پروفیسر سلیم احمد صدیقی

آج سے سینکڑوں سال پہلے کی بات ہے کہ انگلستان میں ایک غریب عورت اپنے اکلوتے بچے کے ساتھ رہتی تھی جس کا نام جیک تھا۔ جیک اپنی ماں کی اکلوتی اولاد ہونے کے باعث بہت لاڈلا تھا۔ شاید یہی وجہ تھی کہ آہستہ آہستہ وہ ایک ضدی لڑکا بنتا چلا گیا۔ اس کی ماں بہت مشکل سے گزر بسر کرتی تھی۔ آخر ایک دن ایسا آیا کہ ماں کے پاس خرچ کرنے کے لیے ایک روپیہ بھی نہ رہا۔ اب اس کے پاس ایک گائے رہ گئی تھی۔ اس نے وہ گائے جیک کے حوالے کی اور کہا کہ اس کو اچھے داموں بیچ آئے تاکہ گھر کا خرچ کچھ دن آسانی سے چل سکے۔

اگلی صبح جیک گائے کو لے کر بیچنے کے لیے نکلا۔ راستے میں اسے ایک قصائی ملا۔ "تم یہ گائے کہاں لے کر جا رہے ہو؟" قصائی نے پوچھا۔

"میں اسے بیچنے کے لیے لے جا رہا ہوں!" جیک نے کہا۔ اچانک جیک کی نظر قصائی کے ہیٹ پر پڑی۔ اس نے اپنا ہیٹ اُلٹا پکڑا ہوا تھا اور اس میں چند رنگ برنگے لوہے کے دانے ڈالے ہوئے تھے جو اپنے رنگوں کے باعث بہت ہی خوبصورت نظر آ رہے تھے۔

"اگر میں یہ گائے خریدوں تو کتنے پیسے لو گے؟" قصائی نے اپنے ہیٹ میں رکھے دانوں کو ہلاتے اور اُچھالتے ہوئے کہا۔ اس نے دیکھ لیا تھا کہ جیک کی نظریں ان دانوں پر جمی ہوئی ہیں۔

"پیسے؟" جیک نے کچھ سوچتے ہوئے کہا "کیا تم مجھے یہ دانے دے سکتے ہو؟"

"ہاں میں تمہاری گائے کے بدلے میں یہ تمام قیمتی رنگ برنگے دانے دے سکتا ہوں!" قصائی نے مسکراتے ہوئے کہا۔

"تو پھر سودا پکا!" جیک بولا۔ اس نے گائے قصائی کے حوالے کر دی اور قصائی نے رنگ برنگے دانے ہیٹ سمیت جیک کے حوالے کر دیئے۔ جیک یہ دانے لے کر خوشی خوشی گھر پہنچا۔ جب وہ ماں کو تمام قصہ بتانے لگا تو ماں نے سر پیٹ لیا۔ اس نے جیک کو بے وقوف، اُلو، گدھا اور نہ جانے کیا کچھ کہا اور غصے میں اس کے ہاتھ سے ہیٹ چھین کر دانوں سمیت اسے باہر آنگن میں اُچھال کر پھینک دیا۔ اُس رات گھر میں کھانے کو کچھ نہ تھا۔ ماں بیٹے دونوں بھوکے ہی سو گئے۔

صبح سویرے جیک کی جب آنکھ کھلی تو وہ صحن میں نکلا اور یہ دیکھ کر حیران رہ گیا کہ رنگ برنگے وہ دانے جو رات ماں نے

آنگن میں ڈالے تھے' وہ اُگ آئے ہیں اور ایک بیل کی شکل میں اتنے اونچے' اتنے زیادہ اونچے چلے گئے ہیں کہ ان کا اوپر کا سرا دکھائی ہی نہیں دے رہا تھا بلکہ آسمان پر موجود بادلوں کے اندر کہیں گم ہو گیا تھا۔

جیک ایک بہادر لڑکا تھا اور اس نے سوچا کہ کیوں نہ بیل کے اوپر چڑھ کر دیکھا جائے۔ اس نے آؤ دیکھا نہ تاؤ' بیل پر چڑھنے لگا۔ اس کی ماں نے کمرے میں سے آکر اسے چڑھتے دیکھا اور روکنے کی کوشش کی لیکن جیک نے ہاتھ ہلا کر اُوپر سے ہی اسے "خدا حافظ" کہہ دیا اور بیل پر چڑھتا چلا گیا۔

وہ اُوپر اور اُوپر چڑھتا چلا جا رہا تھا۔ وہ کئی گھنٹے تک چڑھتا چلا گیا' آخرکار وہ اوپر جا ہی پہنچا۔ اس نے حیرت سے اپنے چاروں طرف دیکھا۔ وہ ایک عجیب و غریب جگہ پر پہنچ گیا تھا۔ یہ ایک بڑا سا صحرا تھا' نہ درخت' نہ جھاڑی' نہ پودا' نہ کھیت اور نہ ہی کوئی جاندار۔

جیک نے ایسے ہی منہ اٹھا کر ایک طرف کو چلنا شروع کر دیا۔ اسے بھوک لگ رہی تھی اور وہ کسی ایسی جگہ کی تلاش میں تھا جہاں اسے کھانے پینے کو کچھ مل جائے۔ اچانک اسے ایک جانب ایک خوبصورت عورت کھڑی نظر آئی۔ یہ ایک پری تھی جس کے ہاتھ میں ایک خوبصورت چھڑی تھی اور اس چھڑی پر سونے کا بنا ہوا ایک مور لگا ہوا تھا۔ جیک ایک بہادر لڑکا تھا اس لیے وہ اسے دیکھ کر بالکل بھی نہ ڈرا اور پری کی طرف آگے بڑھا۔ پری نے اس سے پوچھا کہ وہ کون ہے اور وہاں کیسے آن پہنچا۔ جواب میں جیک نے اب تک کی تمام کہانی کہہ سنائی۔ جب جیک نے اپنی کہانی سنا دی تو پری نے مسکراتے ہوئے اس سے پوچھا "بیٹے! کیا تمہیں اپنے ابو یاد ہیں؟"

"جی نہیں" جیک نے کہا "لیکن مجھے یقین ہے کہ میرے ابو کی کہانی میں کوئی نہ کوئی پراسرار بات ضرور ہے کیونکہ جب بھی میں کبھی امی سے ابو کے بارے میں پوچھتا ہوں تو وہ رونے لگ جاتی ہیں اور بات بیچ میں ہی رہ جاتی ہے!"

"بس' تمہاری امی کی جرأت جواب دے جاتی ہے اس لیے وہ تمہیں کچھ نہیں بتا پاتیں"۔ پری نے کہا "لیکن میں تمہیں تمہارے ابو کے بارے میں ضرور بتاؤں گی کیونکہ میں ان کی دوست تھی"۔

جیک نے پورے دھیان سے پری کی بات سننا شروع کر دی کیونکہ وہ واقعی اپنے ابو کے بارے میں جاننا چاہتا تھا۔ پری نے بتایا "تمہارے ابو اچھے آدمی تھے۔ تمہاری امی بھی بہت اچھی ہیں۔ تمہارے ابو بڑے امیر آدمی تھے۔ ان کے بہت سارے مکان' مال مویشی' روپیہ پیسہ' نوکر چاکر تھے۔ سب کچھ تھا لیکن ان کا ایک بے وفا دوست بھی تھا۔ وہ ایک دیو تھا جس کی انہوں نے کبھی مدد بھی کی تھی لیکن دیو نے ایک دن موقع پا کر انہیں قتل کر دیا اور ان کا تمام روپیہ پیسہ لے کر غائب ہو گیا۔ تم اس وقت بہت چھوٹے تھے"۔

"مگر پری!" جیک نے کہا "تم نے ابو کی اس وقت کوئی مدد کیوں نہ کی؟"

"بیٹے' تم نے بہت صحیح سوال پوچھا ہے" پری نے کہا "دراصل اس وقت پریوں کے بادشاہ نے ایک بات پر ناراض ہو کر مجھے پرستان کی جیل میں قید کر رکھا تھا اور میں بے بس تھی۔ میں اپنی قید بھگت کر کل ہی رہا ہوئی ہوں۔ قصائی کو لوہے کے دانوں والا ہیٹ میں نے ہی دیا تھا تاکہ تمہاری مدد کر سکوں"۔

"اچھا' تو نیک دل پری! مجھے دیو کا اتا پتا بتا دو تاکہ میں اس سے بدلہ لے سکوں!"

"میں تمہیں ابھی بتاتی ہوں" پری نے کہا "تم اس سے اپنے باپ کی دولت بھی چھین لینا اور ہو سکے تو اسے مار ڈالنا تاکہ وہ کسی اور آدمی کو نقصان نہ پہنچا سکے!"

"میں ایسا ہی کروں گا" جیک نے کہا "بس' اب تم جلدی سے مجھے اس کا پتا بتا دو!"

پری نے اسے دیو کے محل کا پتا بتا دیا اور جیک نے چلنا شروع کر دیا۔ شام ہونے کے قریب وہ آخرکار دیو کے محل کے قریب جا پہنچا۔ محل کے دروازے پر اس نے ایک عورت کو کھڑا پایا۔ جیک نے عورت کو بتایا کہ وہ ایک مسافر ہے اور اسے بھوک مٹانے کے لیے ذرا سا کھانا اور سونے کے لیے ذرا سی جگہ درکار ہے۔

عورت نے اس کی باتیں سن کر حیرت کا اظہار کیا اور بولی "میرا شوہر ایک دیو ہے اور وہ آدمیوں کو بڑے شوق سے کھاتا ہے۔ اگر اس نے گھر میں تمہیں دیکھ لیا تو وہ تمہیں کھا جائے گا"

"تمہاری بڑی مہربانی ہو گی اگر تم مجھے محل کے کسی کونے میں چھپا دو اور تھوڑا سا کھانا کھلا دو! میں تمہیں زندگی بھر دعائیں دوں گا!" جیک نے بھولا سا منہ بنا کر عورت سے کہا۔ آخر کار عورت کو ترس آ گیا اور وہ اسے محل کے اندر لے چلی۔ کئی کمروں اور برآمدوں میں سے گزر کر وہ باورچی خانے میں پہنچی اور وہاں ایک کونے میں بٹھا کر جیک کو کچھ کھانے پینے کو دے دیا۔ اتنے میں دیو نے دروازے پر دستک دی۔ عورت بولی "میرا شوہر دیو آ گیا ہے۔ میں دروازہ کھولنے جا رہی ہوں۔ اب تم کسی جگہ چھپ جانا' نہیں تو وہ آ کر تمہیں کھا جائے گا"۔

"آپ کا شکریہ!" جیک نے کہا "خدا میری حفاظت کرے گا۔ اب آپ جائیں!"

جیک باورچی خانے کے ایک کونے میں چھپ گیا۔ تھوڑی دیر بعد دیو باورچی خانے کے قریب کھانے کے کمرے میں بیٹھ گیا اور بیوی اس کے لیے کھانا لگانے لگی۔ دیو نے دو بھنی ہوئی سالم بھیڑیں کھا لیں اور شربت کا ایک پورا گھڑا بھی پی لیا۔ اس کے بعد اس نے زور سے ڈکار ماری اور بیوی سے کہنے لگا: "اب میری نیلی مرغی لے آؤ"۔

عورت دیو کی نیلی مرغی لینے چلی گئی۔ جیک باورچی خانے کے کونے میں سے باہر آ کر کھڑکی کے اندر سے جھانک کر دیکھ رہا تھا۔ اس نے دیکھا کہ عورت اس کے لیے نیلے رنگ کے پروں والی ایک مرغی لے آئی۔ دیو نے مرغی کو میز پر بٹھا دیا اور بولا "لاؤ' ایک انڈا دو!"

مرغی نے سونے کا ایک انڈا فوراً دے دیا۔

"ایک اور انڈا دو!" دیو ہنستے ہوئے اور پہلے انڈے سے کھیلتے ہوئے بولا۔

مرغی نے سونے کا ایک اور انڈا دے دیا۔

یوں مرغی نے دیو کے کہنے پر ایک کے بعد ایک بارہ انڈے دیئے۔ دیو نے ہنستے ہوئے ان انڈوں کو عورت کے حوالے کیا اور کہا "جاؤ' ان انڈوں کو میرے خزانے میں جمع کر دو اور سو جاؤ"۔

بیوی انڈے لے کر وہاں سے رخصت ہو گئی۔ دیو نے مرغی کو وہیں چھوڑا اور قریب ہی پڑے ایک بڑے سے پلنگ پر لیٹ کر سو گیا۔ جلد ہی جیک کو اس کے خراٹوں کی اس طرح کی آواز آنے لگی جیسے آٹا پیسنے کی کوئی چکی چل رہی ہو۔

جیک نے سوچا کہ یہی وقت ہے۔ اس نے چپکے سے باہر نکل کر مرغی کو پکڑا اور آہستہ آہستہ چلتا ہوا محل سے باہر نکل آیا۔ کافی دیر بعد وہ بیل کے اوپر کے سرے پر پہنچ گیا اور بیل پر سے اترتا اترتا اپنی امی کے پاس جا پہنچا۔ امی اس کو دیکھ کر بہت خوش ہوئی اور دوڑ کر اسے گلے سے لگا لیا۔

"دیکھو امی! میں کیا لے کر آیا ہوں؟" جیک نے مرغی دکھاتے ہوئے کہا۔

"یہ تو ایک عجیب سی مرغی ہے۔ اس کے سارے پر نیلے ہیں"۔ جیک کی امی نے حیرت سے کہا۔

"امی امی!" جیک خوشی سے چلایا "یہ مرغی ایک دفعہ میں سونے کے بارہ انڈے دے سکتی ہے" جیک نے دکھایا کہ مرغی کیسے سونے کے انڈے دیتی ہے۔ یہ مرغی ہر روز حکم سن کر ایک کے بعد ایک بارہ سونے کے انڈے دیتی تھی۔

ان انڈوں کو بیچ کر جیک اور اس کی امی امیر ہو گئے اور انہوں نے اپنے گھر کو نیا بنا لیا لیکن جیک کے کہنے پر امی نے بیل کو بالکل نہ چھیڑا۔

جب جیک کو بیل پر چڑھے پورا ایک سال ہو گیا تو جیک نے ماں سے کہا "ماں' کل صبح میں پھر بیل پر چڑھوں گا۔ میرا ایک کام ادھورا ہے' اسے پورا کرنا ابھی میرے ذمے ہے"۔

ماں نہیں چاہتی تھی کہ جیک پھر بیل پر چڑھے۔ مگر جیک نے ماں کو آخر کار قائل کر لیا اور اس بار اجازت لے کر امی کو خدا حافظ کر کے اگلے دن صبح ہی صبح بیل پر چڑھ گیا۔ البتہ بیل پر چڑھنے سے پہلے اس نے اپنا بھیس بدل لیا تھا تاکہ کوئی اسے پہچان نہ سکے۔ پہلے کی طرح چلتا چلتا وہ صحرا میں اتر گیا اور اسی شام پھر دیو کے محل کے باہر جا پہنچا۔ دیو کی بیوی باہر کھڑی دیو کا انتظار کر

رہی تھی۔ جیک نے بھیس بدلا ہوا تھا اس لیے وہ اسے پہچان نہ سکی۔ جب جیک نے اس سے کھانا اور رات گزارنے کے لیے جگہ کا سوال کیا تو وہ کہنے لگی کہ: "ہم بھی پچھلے سال ایک لڑکا وہاں آیا تھا اور اس نے بھی یہی سوال کیا تھا۔ میں نے ترس کھا کر اسے کھانا اور سونے کی جگہ دے دی لیکن بدلے میں وہ لڑکا دیو کی نیلی مرغی چرا کر لے گیا جو سونے کے بارہ انڈے روز دیا کرتی تھی۔ اس کے بعد سے دیو نے مجھ پر سختی شروع کر دی"۔

"مگر میں تو اُس لڑکے جیسا نہیں ہوں" جیک نے کہا "میں تو راستہ بھول کر یہاں آنکلا ہوں۔ آپ مجھے کھانا اور رات گزارنے کی جگہ دے دیں میں آپ کو دعائیں دوں گا کہ آپ کا دیو شوہر آپ پر سختی کرنا بند کر دے!"

عورت کو ترس آگیا اور وہ جیک کو لے کر محل کے اندر چلی گئی۔ باورچی خانے میں جا کر اس نے جیک کو کھانا دیا ہی تھا کہ اتنے میں دروازہ کھلنے کی آواز آئی اور وہ دیو کو دیکھنے چلی گئی"۔

جیک کھانا کھا کر ایک کونے میں چھپ کر لیٹ گیا۔ دیو نے اسی طرح باورچی خانے کے باہر والے کمرے میں آکر کھانا مانگا۔ بیوی نے اس کے لیے تین سالم بھنی ہوئی بھیڑیں تیار کر رکھی تھیں۔ دیو نے انہیں کھا کر شربت کے دو گھڑے پیے اور ایک زور دار ڈکار ماری۔ اس کے بعد اس نے بیوی سے کہا۔ "جاؤ میرا خزانہ لے کر آؤ"۔

بیوی تھوڑی دیر بعد دو بڑے بڑے تھیلے لے کر آئی۔ دیو نے میز پر ان تھیلوں کو الٹا دیا اور سونے، چاندی، ہیرے، جواہرات کا ایک ڈھیر میز پر لگ گیا۔ "ہاہاہا" دیو نے دولت پر پیار سے ہاتھ پھیرتے ہوئے کہا "نیلی مرغی چوری ہو گئی تو کیا ہوا، میں اب بھی امیر ہوں! میں اب بھی امیر ہوں!"

جیک باورچی خانے کی کھڑکی میں سے یہ سارا منظر دیکھ رہا تھا۔

جلد ہی دیو نے دونوں تھیلوں میں سونے، چاندی، ہیرے، جواہرات واپس ڈالے اور ان کا منہ رسی سے باندھ دیا۔ پھر پاس ہی اپنے بڑے سے پلنگ پر لیٹ کر سو گیا۔ جلد ہی وہ زور زور سے خراٹے لینے لگا۔

جیک جھٹ پٹ باہر آیا اور اس نے دیو کے دونوں تھیلے کاندھے پر رکھ لیے اور آہستہ آہستہ چلتا ہوا محل سے باہر نکل گیا۔ چلتے چلتے وہ بیل کے اوپر والے سرے پر جا پہنچا۔ عین اُسی وقت اس نے زور زور سے دوڑنے کی آواز سنی۔ صحرا کی زمین ہل رہی تھی۔ اس نے مڑ کر دیکھا تو دیو بھاگا بھاگا آرہا تھا۔

جیک نے جلدی جلدی بیل پر سے اترنا شروع کر دیا۔ ذرا دیر بعد دیو نے بھی وہاں آکر بیل سے اترنا شروع کر دیا۔

جیک نے بہت پھرتی سے زمین پر اتر کر تھیلے زمین پر پھینک دیئے اور اندر سے کلہاڑی لا کر بیل کو جڑ سے کاٹ ڈالا۔ بیل کے کٹتے ہی دیو دھم سے زمین پر آگرا۔ اس کا سر پھٹ گیا اور تڑپ تڑپ کر مر گیا۔

جیک کی ماں دیو کے گرنے کی آواز سن کر باہر دوڑی دوڑی آئی۔ ابھی وہ چیخنے ہی والی تھی کہ جیک نے اس کے منہ پر ہاتھ رکھ دیا۔ جیک نے اپنی ماں کو تمام قصہ کہہ سنایا۔ اب وہ بہت امیر بن گئے تھے کیونکہ مرحوم باپ کی تمام دولت جیک واپس لے آیا تھا۔ انہوں نے جلد ہی یہ مکان بیچ کر ایک اور بڑا سا مکان خرید لیا اور اس میں ہنسی خوشی رہنے لگے۔

(انگلستان کی لوک کہانی "جیک اینڈ دی بین سٹاک" سے ماخوذ)

☆☆☆

مبارک باد!

اللہ کے فضل و کرم سے تعلیم و تربیت پھر جیت گیا!

آپ سب کو یہ جان کر یقیناً خوشی ہو گی کہ "تعلیم و تربیت" کا اقبال نمبر دعوۃ اکیڈمی، اسلام آباد کی طرف سے ملک بھر کے بچوں کے رسائل میں اول انعام کا حقدار قرار دیا گیا ہے۔ یہ اعزاز جہاں ادارے کے لیے افتخار کا باعث ہے وہاں آپ سب کے لیے بھی خوشی کا موجب ہے۔ ہماری طرف سے آپ کو بھی بہت بہت مبارکباد!

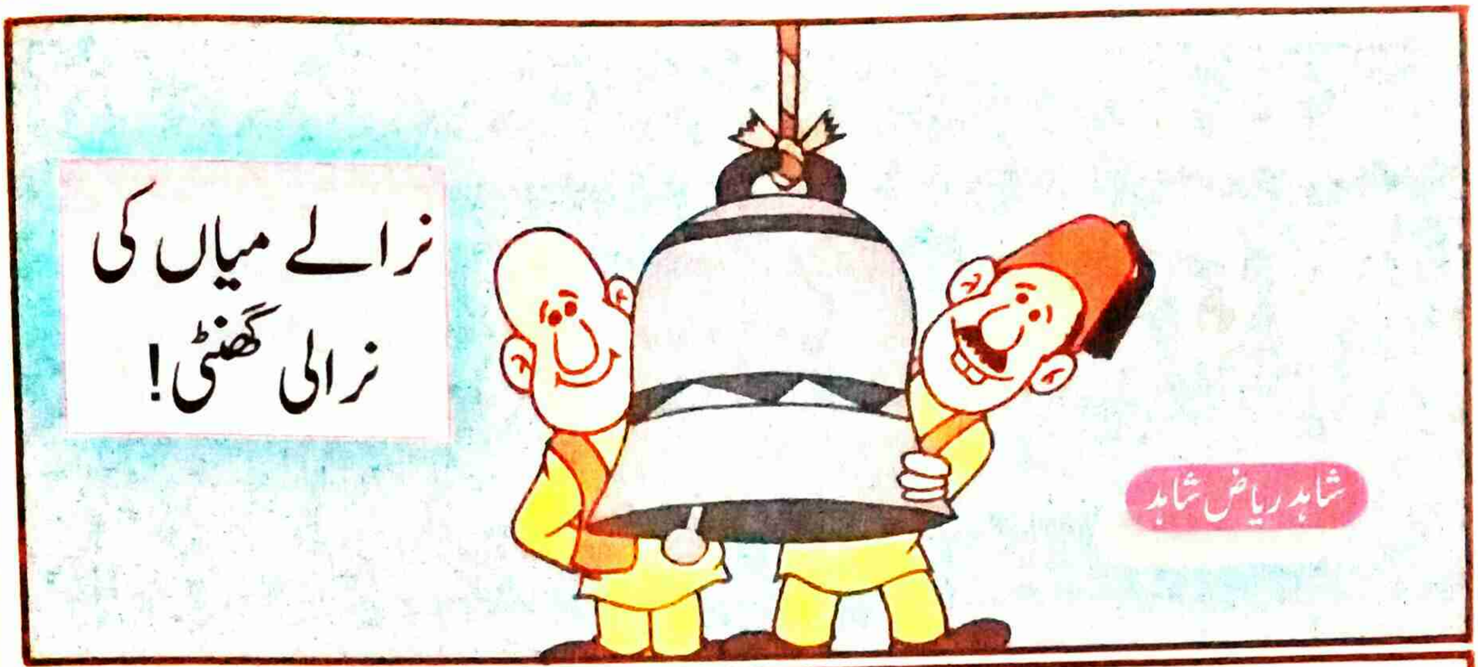

ایک دفعہ نرالے میاں نے ایک بڑی سی گھنٹی خریدی اور ملک صاحب کو لکڑی کا ہتھوڑا دیتے ہوئے بولے:

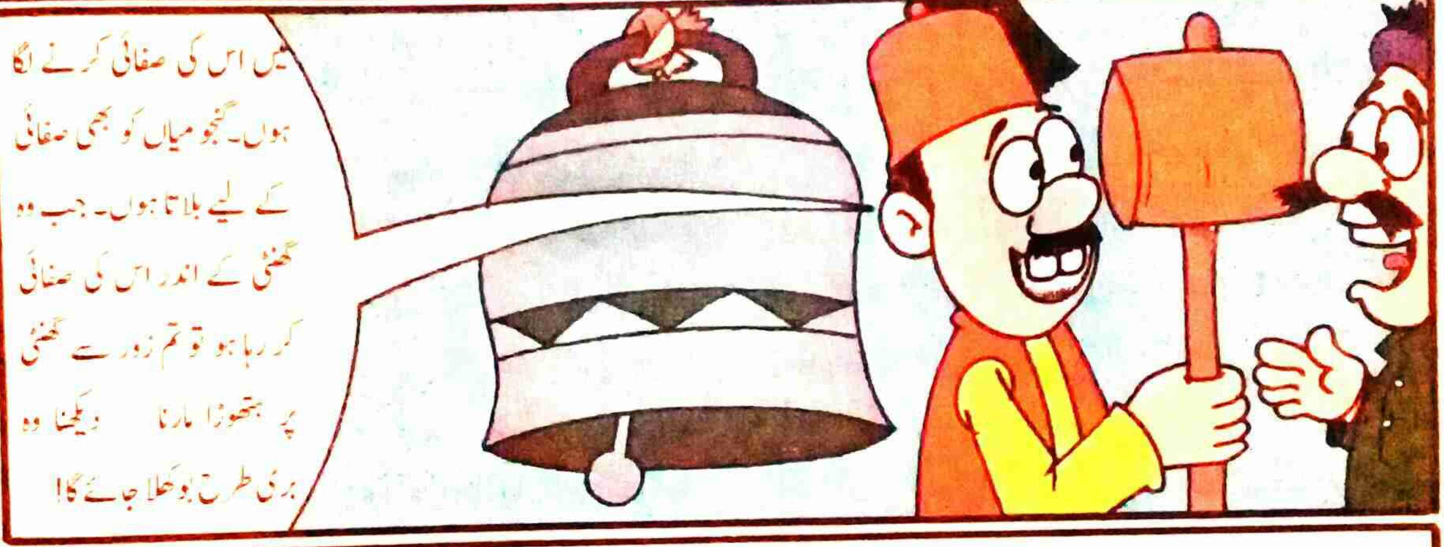

ملک صاحب ہتھوڑا لے کر ایک طرف بیٹھ گئے اور نرالے میاں نے گنجو کو آواز دی:

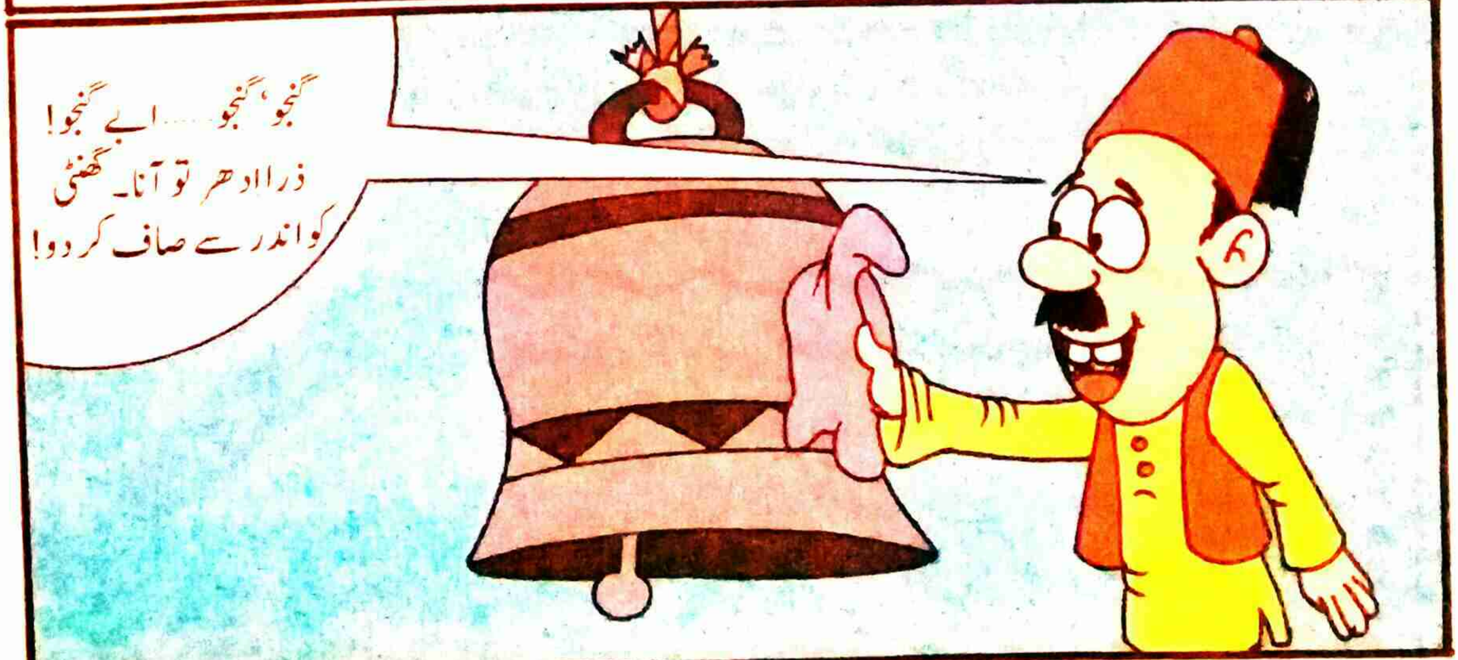

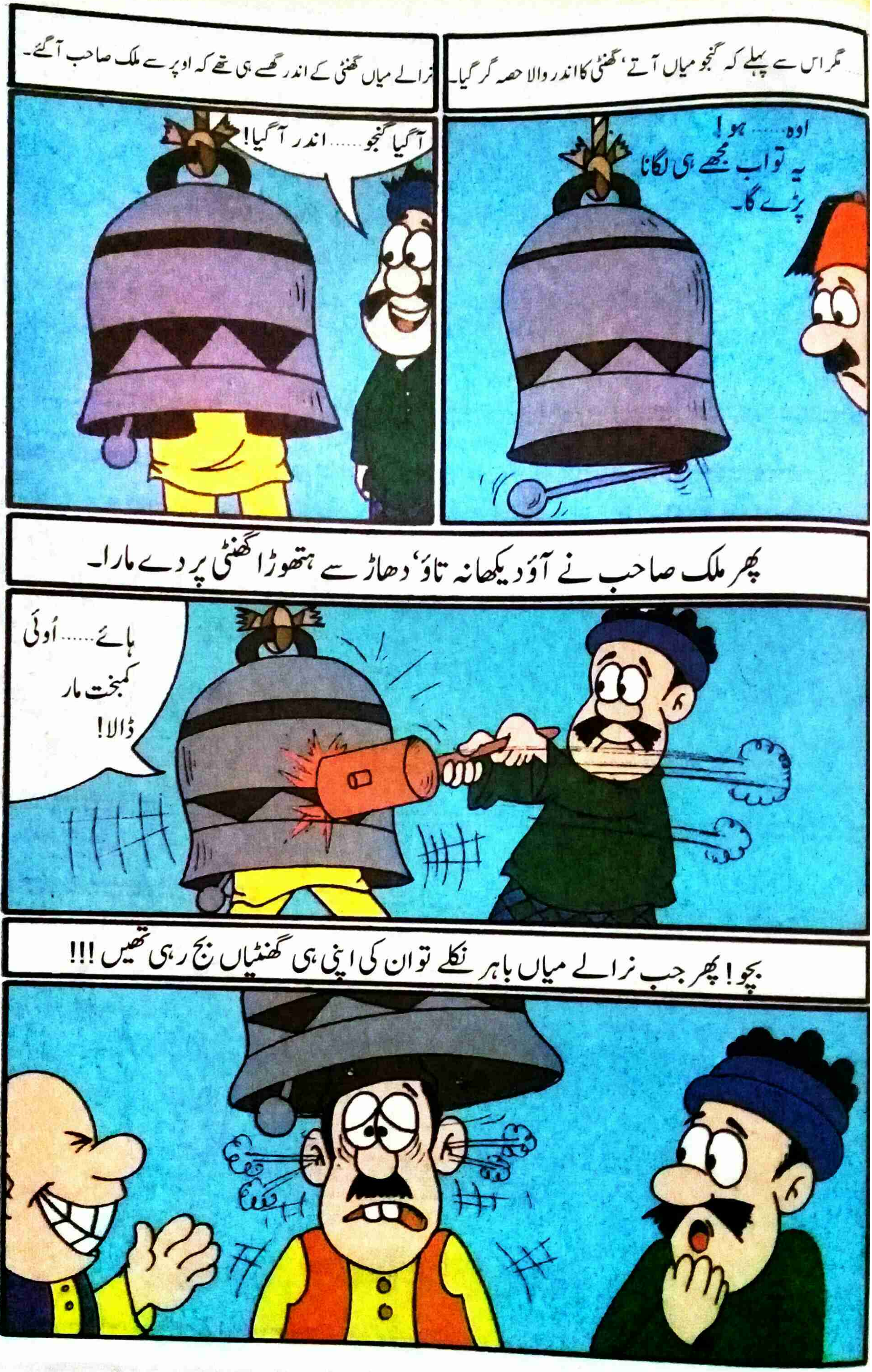

مگر اس سے پہلے کہ گنجو میاں آتے، گھنٹی کا اندر والا حصہ گر گیا۔
اوہ...... ہو! یہ تو اب مجھے ہی لگانا پڑے گا۔
نرالے میاں گھنٹی کے اندر گھسے ہی تھے کہ اوپر سے ملک صاحب آگئے۔
آگیا گنجو...... اندر آگیا!
پھر ملک صاحب نے آؤ دیکھا نہ تاؤ، دھاڑ سے ہتھوڑا گھنٹی پر دے مارا۔
ہائے...... اُوئی کمبخت مار ڈالا!
بچو! پھر جب نرالے میاں باہر نکلے تو ان کی اپنی ہی گھنٹیاں بج رہی تھیں!!!

پروفیسر مجیب ظفر انوار حمیدی

"تعلیم و تربیت" کے لیے ایک عرصے سے باقاعدہ لکھ رہے ہیں۔ آٹھ نو سال کی عمر میں پہلی کہانی لکھی۔ 1980ء میں یونیسف سے ایوارڈ حاصل کیا۔ آج کل کراچی میں اردو ادب کے حوالے سے درس و تدریس کے شعبے میں خدمات انجام دے رہے ہیں۔

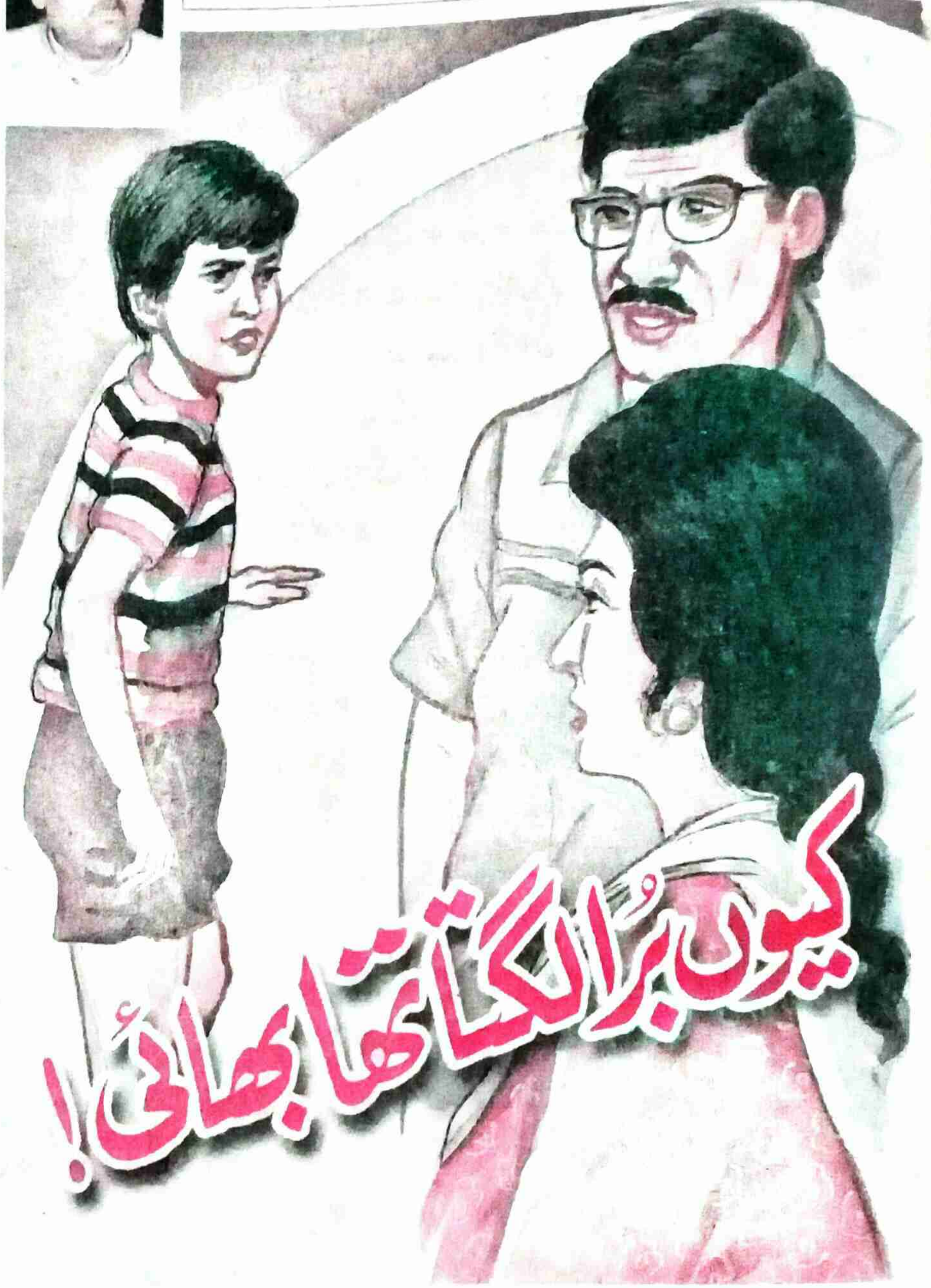

کیوں بُرا لگا تھا بھائی!

کبابوں کا پسا ہوا مزے دار قیمہ ڈونگے میں رکھا تھا۔ امی جان قریب ہی بیٹھی پیاز، ہری مرچیں، ہرا دھنیا کتر رہی تھیں تاکہ اس ہرے مسالے کو قیمے میں ملا کر مزے دار کباب تیار کیے جا سکیں۔

اتنے میں عامر میاں باہر سے کھیل کود کر گھر میں داخل ہوئے۔ ماں کو دیکھ کر سلام کیا۔ ماں نے مسکراتے ہوئے سلام کا جواب دیا اور دعا بھی۔ اچانک عامر کی نگاہ پسے ہوئے قیمے پر پڑی۔ اسے کبابوں کا کچا قیمہ بے حد پسند تھا۔ آؤ دیکھا نہ تاؤ، بے دھلا ہاتھ ڈونگے میں ڈالا، مٹھی بھر قیمہ نکال منہ میں رکھ لیا اور مزے مزے سے کھانے لگے۔

امی جان کا موڈ ایک دم سے خراب ہونے لگا۔

"بیٹے...... یہ کیا حرکت ہے۔ باہر کے جراثیم والے ہاتھ کھانے کی چیز میں ڈال دیے۔ اب وہ جراثیم کھانے کے برتن میں بھی چلے گئے اور تمہارے پیٹ میں بھی۔ قیمہ کھانا ہی تھا تو ہاتھ دھو لیتے۔ تھوڑا صبر کر لیتے میاں یا مجھے کہہ دیتے، کیا میں تمہیں کھانے کی چیز دینے سے انکار کر دیتی؟" ماں نے کچھ ایسی بے بسی سے کہا کہ عامر شرمندہ ہونے لگا۔

جی میں آیا کہ ماں سے "سوری" کر لے لیکن جیسے کسی خیال نے روک دیا۔ "چھوڑیں بھی ماما...... کھانے کی چیز تھی۔ بس کھا لی!" یہ کہہ کر وہ باتھ روم کی طرف بڑھ گیا۔

ماں نے اس بدکلامی پر خون کا سا گھونٹ پی لیا اور خاموش ہو گئیں۔ ہاں رات کو عشاء کی نماز سے فارغ ہو کر حسب معمول "سورہ الملک" پڑھی پھر شوہر کے لیے حسب عادت دودھ کا گلاس لے کر کمرے میں داخل ہوئیں۔ کامران صاحب اخبار پڑھ رہے تھے۔ یہ ان کی پرانی عادت تھی۔ صبح سویرے اخبار کی سرخیوں پر موٹی موٹی نظریں ڈال کر دفتر چلے جاتے اور رات گئے دفتر سے

واپسی ہوتی' لہٰذا یہ ہی وقت ہوتا جب وہ مزے سے اخبار پڑھتے۔ ناہید بیگم نے شوہر کے سرہانے سائڈ ٹیبل پر گلاس پرچ (چھوٹی سی پلیٹ جو چائے کی پیالی کے ساتھ ہوتی ہے) سے ڈھک کر رکھا اور پائنتی بیٹھ کر شوہر کے پاؤں دابنے لگیں۔

"ارے...... ارے...... کیا کرتی ہو۔ روز منع کرتا ہوں۔ اچھا نہیں لگتا نیک بخت۔ تم خود دن بھر گھر کی ذمہ داریوں میں تھک جاتی ہو۔ اس کا مطلب ہے کہ پھر ہمیں تمہارے پیر بھی......"۔

کامران صاحب نے مسکراتے ہوئے اپنی بات نامکمل چھوڑ دی۔

ناہید بیگم ہنس پڑیں۔ "ارے کیسی باتیں کرتے ہیں آپ۔ اللہ آپ کو ہم سب کے سروں پر سلامت رکھے"۔

کامران صاحب نے عینک اتار کر سائڈ ٹیبل پر رکھی۔ ٹانگیں پیچھے کو کھنچیں اور اٹھ کر بیٹھ گئے۔ تکیہ گود میں رکھ لیا۔ پھر بڑے غور سے بیوی کو دیکھ کر کہا!

"کیا بات ہے جناب"۔

"جج...... جی جی ہاں...... جی ہاں...... میں بہت خوش ہوں"۔

"ارے کیا ہم سے کوئی خطا ہو گئی بیگم!"

"نہیں کچھ نہیں!" وہ بولیں۔

"اچھا...... چلیے مان لیتے ہیں!" کامران صاحب نے گردن گھما کر سائڈ ٹیبل پر رکھا ہوا دودھ کا گلاس اٹھا لیا۔

"سنیے میاں!" بیوی نے پکارا۔

"جی سنائیے بیوی!" کامران صاحب شوخ لہجے میں بولے۔

"وہ...... عامر...... وہ عامر!"

"رات خاصی ہو چکی ہے' عامر اپنے کمرے میں آرام سے سو رہا ہو گا۔ کیا بات ہے؟ کیا عامر کی طبیعت ٹھیک نہیں ہے؟" کامران صاحب نے تشویش ناک انداز سے بیوی کو دیکھ کر سوال کیا۔

"جی نہیں...... اللہ پاک کا کرم ہے کہ ہمارا بیٹا پڑھائی لکھائی' ہر لحاظ سے اچھا...... بلکہ بہت اچھا ہے...... لیکن!"

"بھئی لیکن کے آگے بھی تو کچھ کہیے بیگم!" کامران صاحب خاصے سنبھل کر بیٹھ گئے۔ ناہید بیگم کی آنکھوں میں اچانک آنسو آگئے۔ شام کا واقعہ میاں کے گوش گزار کر دیا۔

"اس روز میں نے تندور سے خمیری روٹیاں منگوائیں تو راستے میں ایک روٹی کھا لی۔ میں نے سمجھایا کہ پیارے رسول ﷺ نے چلتے پھرتے کھانے سے منع فرمایا ہے تو برا ماننے لگا۔ اتوار کی شام واش روم استعمال کر کے پانی بھی نہیں بہایا۔ آرام سے ہاتھ نہیں دھوئے۔ ہر کام میں عجلت۔ ہر کام میں لاپروائی۔ ذرا سوچیے آپ' کل کو تو یہ لتیں (بری عادتیں) پختہ ہوتی چلی جائیں گی۔ آٹھویں میں پڑھتے ہیں موصوف اور یہ بچکانہ انداز' بلکہ نادانیاں' لوگ کیا کہیں گے کل کو ذرا سوچیے"۔ وہ خاصی پریشان تھیں۔

"اوہو...... تم تو کچھ زیادہ ہی پریشان ہو گئی ہو۔ کل اتوار ہے' میں خود سمجھا دوں گا عامر کو۔ تم خاطر جمع رکھو...... سو جاؤ' رات خاصی ہو گئی ہے"۔

"جی بہتر...... اللہ حافظ' شب بخیر!"

"شب بخیر!" دودھ پی کر کامران صاحب نے کروٹ بدل لی۔ ناہید بیگم نے قرآنی آیات آہستہ آہستہ پڑھیں۔ شوہر پر دم کیا' عامر کے کمرے میں جا کر اس کے ماتھے پر آہستہ سے پیار کیا' دعائیں پھونکیں' پھر اپنے کمرے میں آکر لائٹ آف کی اور اسم شریف کا ورد کرتی اپنے پلنگ پر لیٹ گئیں۔ آنکھیں موند لیں اور ذہن میں اپنے اکلوتے بیٹے کا تصور کرتی رہیں۔ وہ اپنی اکلوتی اولاد کو ہر لحاظ سے بہترین دیکھنا چاہتی تھیں۔ عامر تھا بھی انتہائی باادب اور فرماں بردار لیکن بڑھتی عمر کے ساتھ اس کے مزاج میں کچھ ایسی شوخیاں بھی شامل ہو رہی تھیں جو گستاخی کے زمرے میں آتی تھیں۔

اگلے روز اتوار تھا۔ ناشتے کے بعد ابو جان گملوں کو پانی دینے لگے تو عامر ان کی مدد کرنے لگا۔ اچانک ایک چھوٹا سا مینڈک سنگ مرمر کے بڑے سے گملے کے پیچھے سے نکل کر بھاگنا ہی چاہتا تھا کہ عامر نے لپک کر اسے دبوچا اور پتلون کی جیب میں ڈالنے کی کوشش کرنے لگا۔

"یہ کیا کر رہے ہو بیٹا؟" ابو جان نے پوچھا۔ وہ اپنا غصہ

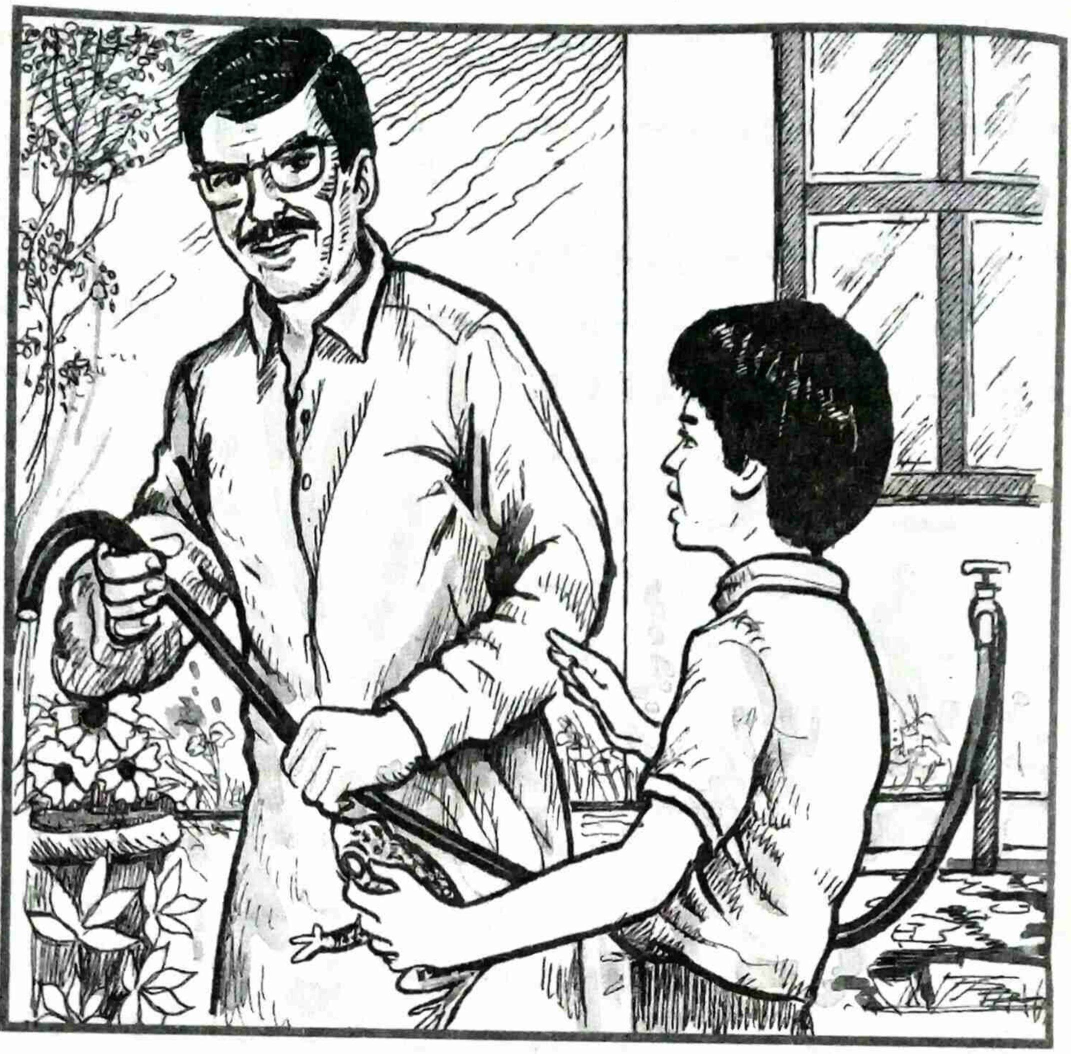

نظر انداز کر گئے۔ "ابو یہ فراگ ہے۔ کل مس ثناء نے جو بیالوجی پڑھاتی ہیں بچوں سے کہا تھا کہ جائیے اسکول کے باغ میں جا کر فراگ پکڑ کر لائیں، آپ کو مینڈک ڈائی سیکٹ (کاٹنا) کرنا سکھایا جائے گا لیب میں تاکہ نائنتھ کلاس (جماعت نہم) میں آپ کو حیاتیات (بیالوجی) کے پریکٹیکل میں کوئی پریشانی نہ ہو"۔

عامر نے باپ کو تمام معلومات فراہم کر دیں۔

"تو بیٹا...... فراگ کو امی سے کوئی صاف بڑی بوتل یا جار لے کر اس میں رکھ دو، مر تو نہیں جائے گا یہ بے چارہ؟"

عامر ہنس پڑا۔ "نہیں ابو اس کو شاپر (پلاسٹک کی تھیلی) میں تھوڑا سا، بالکل تھوڑا سا پانی چھڑک کر، شاپر میں درمیانے سوراخ کر کے رکھوں گا تو یہ ٹھیک رہے گا بالکل!"

"ہو...... اچھا تو پھر تم جاؤ"۔

عامر مڑا ہی تھا کہ اس کا دوست انجم کیک کا ٹکڑا کھاتا گیٹ سے اندر داخل ہوا۔ "عامر...... عامر...... کرکٹ کھیلنے چل رہے ہو!"

ابو نے محسوس کیا کہ انجم نے ان کو سلام نہیں کیا۔ وہ بڑے بدتمیز انداز سے کیک کا بڑا سا ٹکڑا یوں کھا رہا تھا جیسے کسی سے چھین کر بھاگا ہو۔ حالانکہ وہ انجم کے والد اقبال صاحب کو اچھی طرح جانتے ہیں۔ بڑے متین اور شریف انسان ہیں وہ۔

"ہاں ہاں...... چلو چلتے ہیں، میں امی جان سے پوچھ کر آتا ہوں، اور یہ فراگ رکھ کر!" عامر نے کہا۔

"ارے واہ...... دکھاؤ یار ڈڈو کو!" انجم نے اپنا کیک عامر کو پکڑاتے ہوئے مینڈک کو گندے کریم لگے ہاتھوں میں آرام سے لے لیا۔ "بے حس!" ابو کے منہ سے آہستہ سے نکلا۔

"ارے واہ یار...... کل اسے لیب میں ڈائی سیکٹ کریں گے، کتنا مزہ آئے گا"۔ اتنے میں عامر نے کیک بے تکلفی سے منہ میں رکھ لیا۔ "ہاں ہاں کھاؤ یار...... باپ کا مال ہے۔ مزے کرو"۔ انجم نے قہقہہ لگا کر کہا۔

اب تو کامران صاحب کے صبر کا پیمانہ لبریز ہو گیا۔

کیک عامر کے ہاتھ سے چھین کر انجم کو پکڑایا اور چیخ کر کہا! "نکل جاؤ ادھر سے...... ورنہ تمہارے والد صاحب سے بات کرتا ہوں!"

"ابو" عامر نے کچھ کہنا چاہا مگر انجم غصے سے پیر پٹختا، مینڈک ہوا میں اچھال کر یہ جا وہ جا۔

"یہ ہے دوست تمہارا...... میاں دوست تو دوست کا آئینہ ہوتا ہے۔ زندگی میں کتاب، غذا اور دوست کا انتخاب بہت سوچ سمجھ کر کیا جاتا ہے، چلو بھاگو اندر۔ حلیہ درست کرو دس منٹ میں اپنا، گندے ہاتھ سے کیک بغیر اجازت کھاتے ہوئے تمہیں شرم

نہیں آئی ذرا سی' کیا پیٹ بھر کر ناشتا نہیں کیا تھا"۔ عامر نے کہنا چاہا کہ انجم اس کا بے تکلف دوست ہے' بریک میں اس کا لنچ وہ بھی چھین کر کھا جاتا ہے۔ لیکن ابو اتنے غصے میں تھے کہ اس کی ہمت نہ پڑی' سر جھکا کر اندر چلا گیا۔

مغرب کی نماز کے بعد ابو نے اسے بلوایا۔

وہ کچھ ناراض ناراض سا تھا۔

"بیٹھو بیٹا' یہاں میرے سامنے والی کرسی پر!" عامر کرسی پر بیٹھ گیا۔ آنکھیں کچھ سرخ سرخ سی تھیں جیسے رویا ہوا ہو۔ امی جان بھی قریب آکر بیٹھ گئیں۔

"آپ جایئے بیگم میری رائٹنگ ٹیبل پر ایک کاغذ موٹے قلم سے لکھا ہوا رکھا ہے وہ لے کر آجایئے"۔

"جی اچھا" وہ اُٹھ کھڑی ہوئیں اور تھوڑی دیر بعد صاف ستھرا لکھا ہوا کاغذ لے آئیں۔ کامران صاحب نے بیٹے کو دیکھ کر کہا: "میں نے تمہارے لیے ایک کہانی لکھی ہے' اسے بچوں کے کسی رسالے میں اپنے نام سے شائع کروالینا"۔

عامر کو اپنی کہانیاں' نظمیں' تصویریں شائع کروانے کا بہت شوق تھا۔ اس شوق کی تکمیل کے لیے وہ مختلف ماہانہ رسالوں کو لطیفے' پہیلیاں وغیرہ لکھ کر بھیجتا رہتا تھا۔ لیکن کہانی لکھنا اسے آتی ہی نہیں تھی۔ ابو کی زبانی یہ بات سن کر وہ خوش ہو گیا۔

"سچ ابو!"

"ہاں میاں...... ذرا پڑھو تو" کاغذ عامر کو پکڑا دیا۔ "ابو اتنا صاف صاف لکھا ہے آپ نے"۔

"میں نے بچپن میں تختی لکھی ہے۔ ہاں پڑھو تو!"

انہوں نے مسکراتے ہوئے بیوی کو دیکھا جو بے چاری حیران پریشان بیٹھی یہ سب کچھ دیکھ رہی تھیں۔

عامر میاں نے پڑھنا شروع کیا۔ اس کی اُردو بلند خوانی (ریڈنگ) بہت اچھی تھی۔

"ایک مرتبہ کا تذکرہ ہے۔ کسی شہر میں ایک لڑکا رہتا تھا۔ وہ لڑکا بہت اچھا اور ذہین تھا۔ لیکن لاپروا تھا۔ گھر کا سودا سلف راستے میں کھا لیتا۔ بغیر ہاتھ دھوئے کبابوں کا قیمہ کھاتا۔ صفائی کو وہ آدھا ایمان تو کہتا تھا لیکن ان باتوں پر عمل نہیں کرتا تھا۔ واش روم میں پانی نہیں بہاتا......"۔ اتنا پڑھ کر عامر نے ماں باپ دونوں کی طرف دیکھا۔ اس کے چہرے پر پریشانی اور ندامت کے آثار تھے۔

"پڑھو بیٹا آگے" ماں نے کہا۔ وہ میاں کی حکمت عملی سمجھ گئی تھیں۔ عامر نے بددل انداز سے آگے پڑھنا شروع کیا!

"پھر وہ لڑکا بڑا ہو گیا۔ ایک کالج میں پروفیسر ہو گیا۔ یعنی بچوں کو پڑھانے لگا۔ ایک روز کالج کنٹین والے نے سوئپر (خاکروب) نے اور شاگردوں نے پرنسپل صاحب سے شکایت کر کے اسے نوکری سے نکلوا دیا"۔

"ہاں...... ہاں آگے پڑھو شاباش!"

"لیکن ابو سر کو نوکری سے......" عامر نے کچھ کہنا چاہا لیکن باپ کو دیکھ کر دوبارہ پڑھنا شروع کر دیا۔ اب اس کا لہجہ بے حد شرمندہ اور تھکا تھکا سا تھا۔

"نوکری سے ایسے نکلوا دیا کہ کنٹین والے نے پرنسپل صاحب سے کہا کہ عامر صاحب بغیر بتائے چیزیں اٹھا کر کھا جاتے ہیں۔ سوئپر نے کہا کہ سر واش روم میں فلیش نہیں کرتے۔ شاگردوں نے شکایت کی کہ سر عام فراگ ڈائی سیکٹ کر کے ان ہی ہاتھوں سے ان کے پریکٹیکل جرنل (رجسٹر) چیک کرتے ہیں۔ پرنسپل صاحب نے سر عامر کو بہت برا کہا اور اسے انتہائی سخت سست کہہ کر ملازمت سے جواب دے دیا۔ یوں ایک لڑکے کی بچپن کی لاپروائی اس کے گھر والوں اور اس کے اپنے لیے کس قدر خطرناک ثابت ہوئی"۔

امی اور ابو نے دیکھا کہ عامر جو بڑی دقت سے رندھی ہوئی آواز میں کہانی کا اختتام کر رہا تھا۔ اب پھوٹ پھوٹ کر رو رہا تھا۔

"مجھے معاف کر دیں ابو امی! پلیز۔ میں انجم سے بھی دوستی نہیں کروں گا۔ سوری امی۔ سوری ابو!"

ابو نے آگے بڑھ کر اسے گلے سے لگا لیا۔ دونوں میاں بیوی کی آنکھوں میں آنسو تھے۔ ......لیکن میرے جان سے پیارے بچو! سنو! اور غور سے سنو۔ یہ آنسو خوشی کے آنسو تھے۔ ایک صبح کا بھولا شام کو گھر لوٹ آئے تو وہ بھولا کب ہوا بھلا؟ بس سو جاؤ یا کوئی کام کرو' کہانی ختم...... اب تھک گیا میں بھی! ☆☆

سائنس کی دنیا

گوجرانوالا میں 1953ء میں پیدا ہوئے۔ ایم اے کرنے کے بعد شعبہ تدریس سے وابستہ ہوئے۔ بچوں کے لیے سائنسی اور معلوماتی مضامین لکھنے میں خاص مہارت رکھتے ہیں۔

گھاس

عبدالحمید عابد

گھاس قدرت کا ایک عجوبہ ہے۔ آپ کرہ ارض کے کسی بھی حصے میں چلے جائیں۔ گھاس ہر جگہ آپ کے استقبال کے لیے موجود ہو گی۔ ایک اندازے کے مطابق زمین کا پانچواں حصہ گھاس نے گھیر رکھا ہے۔ اب تک کی تحقیق کے مطابق ...... گھاس کی چھ ہزار سے زائد قسمیں دریافت کی جا چکی ہیں۔ مختلف علاقوں میں گھاس کی مختلف شکلیں پائی جاتی ہیں۔ کہیں گھاس پتلی اور چھوٹی ہے کہیں لمبی اور موٹی۔ کہیں اس کے ریشے چمک دار و ملائم اور خوب صورت ہیں اور کہیں کھردرے اور سخت۔ جنوبی امریکا اور افریقہ کے بعض حصوں میں گھاس کے عجیب عجیب نمونے دیکھے گئے ہیں۔ گھاس کے بعض پودے خرگوشوں' چوہوں اور اس طرح کے دوسرے چھوٹے جانوروں کی شکل و شباہت سے ملتے جلتے ہیں۔ گھاس کے رنگوں میں فرق پایا جاتا ہے۔ شمالی امریکا جنوبی امریکا' روس اور نیوزی لینڈ میں گھاس کے بڑے بڑے میدان ہیں۔ نیوزی لینڈ کی گھاس سب سے اچھی اور اعلیٰ درجے کی ہے اور ماہرین کی تحقیق کے مطابق اس میں توانائی کی مقدار بھی بہت زیادہ ہے۔

سائنس دانوں کا کہنا ہے کہ گھاس ایک ایسی شے ہے جو سورج سے بہت زیادہ توانائی حاصل کرتی ہے۔ ایک ایٹم بم جتنی قوت رکھتا ہے اتنی ہی قوت سات سو ایکڑ میں پھیلی ہوئی گھاس ایک دن میں سورج سے جذب کر لیتی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ گھاس جسے ہم نہایت حقیر اور فضول سمجھتے ہیں سونے سے بھی کہیں زیادہ قیمتی ہے۔ معمولی قسم کی گھاس اگرچہ پتلے ریشے کی مانند ہوتی ہے لیکن اگر خوردبین سے دیکھا جائے تو اس کی بناوٹ نہایت حیران کن اور عجیب نظر آتی ہے۔

اس میں پھول بھی لگتے ہیں اگرچہ وہ ہمیں نظر نہیں آتے ایک محتاط اندازے کے مطابق گھاس کا ایک معمولی پودا پانچ کروڑ ریزوں سے مل کر بنتا ہے۔

بہار کے موسم میں گھاس اپنے اندر توانائی کا ذخیرہ جمع کرتی ہے تاکہ گرمیوں میں اس ذخیرے کی مدد سے زندہ رہا جا سکے۔ گھاس کے اندر جب تک یہ ذخیرہ باقی رہتا ہے۔ اس کی ہریالی اور تراوت میں کوئی فرق نہیں آتا۔ لیکن توانائی کا ذخیرہ ختم ہوتے ہی گھاس خشک ہو کر زرد پڑ جاتی ہے۔

گھاس کی ایک خوبی یہ ہے کہ اسے کتنی بار اکھاڑ ڈالیے مویشیوں کو چرا دیجیے پھر اسی جگہ سے نکل آئے گی جبکہ بعض پودے ایک دفعہ کاٹ دیے جائیں یا انہیں توڑ دیا جائے تو دوبارہ

نہیں اُگتے۔

گھاس کی بعض قسمیں ایسی ہیں جن میں رنگ برنگے پھول کھلتے ہیں۔ پھول نکلنے کا وقت بھی نرالا ہے یعنی موسم خزاں کی بالکل ابتدا میں۔ بعض پھول اناس کی شکل کے ہوتے ہیں اور بعض مکئی کے بھٹوں کی طرح دانے دار۔ گھاس کی ایک قسم ایسی ہے کہ اگر اس پر ہاتھ پھیر دیا جائے تو اس طرح کٹ جاتا ہے جیسے ریزر بلیڈ سے کاٹا گیا ہو۔ یہ گھاس زیادہ تر برازیل کے جنگلوں میں پائی جاتی ہے۔ جانور اور انسان اس کے قریب سے گزرتے ہوئے خوف کھاتے ہیں۔

کیلے کا درخت آپ نے دیکھا ہوگا اس کے پتے کتنے بڑے بڑے ہوتے ہیں۔ حقیقت میں یہ درخت نہیں بلکہ گھاس ہے۔ گھاس کی خوبی یہ ہے کہ ڈنٹھل پر ایک بار پھل آجانے کے بعد وہ بے کار ہو جاتا ہے اور اگلے موسم میں اسی جگہ دوسرا نیا ڈنٹھل نکل آتا ہے۔ "ترفلس" نامی گھاس شاہ بلوط کی جڑ کے قریب اُگتی ہے۔ کالے رنگ کی یہ گھاس نہایت لذیز ہوتی ہے اور بڑی مہنگی ہوتی ہے۔ زیادہ تر فرانس اور اٹلی میں پائی جاتی ہے۔ آئرلینڈ میں سمندر کے ساحلی علاقوں پر سرخ رنگ کی ایک گھاس اُگتی ہے اس گھاس سے نہایت عمدہ اور خستہ روٹیاں تیار کی جاتی ہیں۔ کوکو گھاس سے کوکین، سمندری گھاس سے نشہ آور دوائیں اور سنکونا گھاس سے کونین بنتی ہے۔

گھاس سیلاب کے موسم یا ضرورت سے زائد بارش میں پانی اپنے اندر جذب کر کے نہ صرف زمین کو تباہ ہونے سے بچاتی ہے بلکہ اس کی زرخیزی میں بھی اضافہ ہو جاتا ہے۔

کھیل کے وسیع میدان و پارک اسکولوں اور کالجوں کے گراؤنڈ کرکٹ کی فیلڈ، یہ سب گھاس کے مرہون منت ہیں۔

بہترین تحفہ

بچے کے لیے بہترین تحفہ کتاب ہے۔ کتاب بچے کو کئی برائیوں سے بچاتی ہے اور اس کے لیے بہترین ساتھی ثابت ہوتی ہے۔ فیروز سنز لاہور۔ راولپنڈی۔ کراچی بچوں کے لیے مفید اور دلچسپ کتابیں چھاپنے میں دنیا بھر میں شہرت رکھتے ہیں۔

کام جن کے لیے عبادت تھا

اللہ تعالیٰ نے ان لوگوں کو اس دنیا میں بڑی عزت اور نام دیا ہے، جنہوں نے اپنے کام کو ہمیشہ فرض اور عبادت سمجھ کر کیا۔ یہ لوگ معاشرتی، معاشی اور جسمانی تکالیف کے باوجود ان تھک محنت کرنے والے تھے۔ بلاشبہ ایسے باہمت لوگوں کے لیے ان رکاوٹوں کی کوئی اہمیت نہیں ہوتی۔

☆ ہمارے عظیم قائد..... قائداعظم محمد علی جناحؒ شدید علالت کے باوجود اپنے معالج کی ہدایات کے برعکس سولہ سولہ گھنٹے کام کرتے تھے۔ آخر دم تک وہ اپنے فرائض کامیابی سے انجام دیتے رہے۔

☆ عظیم چینی رہنما ماؤزے تنگ ایک دفعہ اپنی انقلابی جدوجہد کے دوران ایک تنگ و تاریک غار میں چند ساتھیوں کے ہمراہ محصور ہو کر رہ گئے۔ خوراک اور پانی کی شدید قلت، ناقابل برداشت گرمی، حبس اور دشمنوں کا خوف ایک طرف مگر ماؤ اس غار میں ہر چیز سے بے نیاز لیمپ جلا کر سارا سارا دن کام میں مصروف رہتے تھے۔

☆ آخری عمر میں روسی لیڈر لینن کے جسم کا دایاں حصہ فالج کی وجہ سے ناکارہ ہو گیا تھا مگر انہوں نے اس حالت میں بھی بستر کی بجائے میز کو ترجیح دی۔ ایک عرصہ تک معذوری کی وجہ سے وہ بائیں ہاتھ سے لکھنے کا کام انجام دیتے رہے۔

☆ امریکی مصنف جارج تھامس کئی کئی دن فاقوں کا شکار رہتا تھا۔ اس کا کمرہ انتہائی تنگ اور گندہ تھا مگر وہ اس ناقابل برداشت ماحول میں بھی لکھتا رہا۔ یہاں تک کہ بیماری نے اس کے ہاتھوں کو مفلوج کر دیا مگر پھر بھی اس نے لکھنے کا عمل جاری رکھا۔ وہ اپنے ہاتھوں کو کسی وزنی چیز سے باندھ کر انتہائی تکلیف کے باوجود گھنٹوں لکھتا رہتا تھا۔

☆ شہرہ آفاق مصنف اور اخبار نویس رڈیارڈ کپلنگ کی نظر بڑی کمزور تھی۔ ڈاکٹروں کا خیال تھا کہ زیادہ لکھنے یا پڑھنے سے وہ اندھا ہو سکتا ہے۔ مگر اس نے موٹے شیشے کی عینک لگائی اور ثابت قدمی کے ساتھ عدسے کی مدد سے پڑھتا اور لکھتا رہا۔

☆☆ جنید احمد

بلاعنوان

اس کارٹون کا اچھا سا عنوان تجویز کیجیے اور 500 روپے کی کتابیں لیجیے۔
عنوان بھیجنے کی آخری تاریخ 10 جون 2003ء

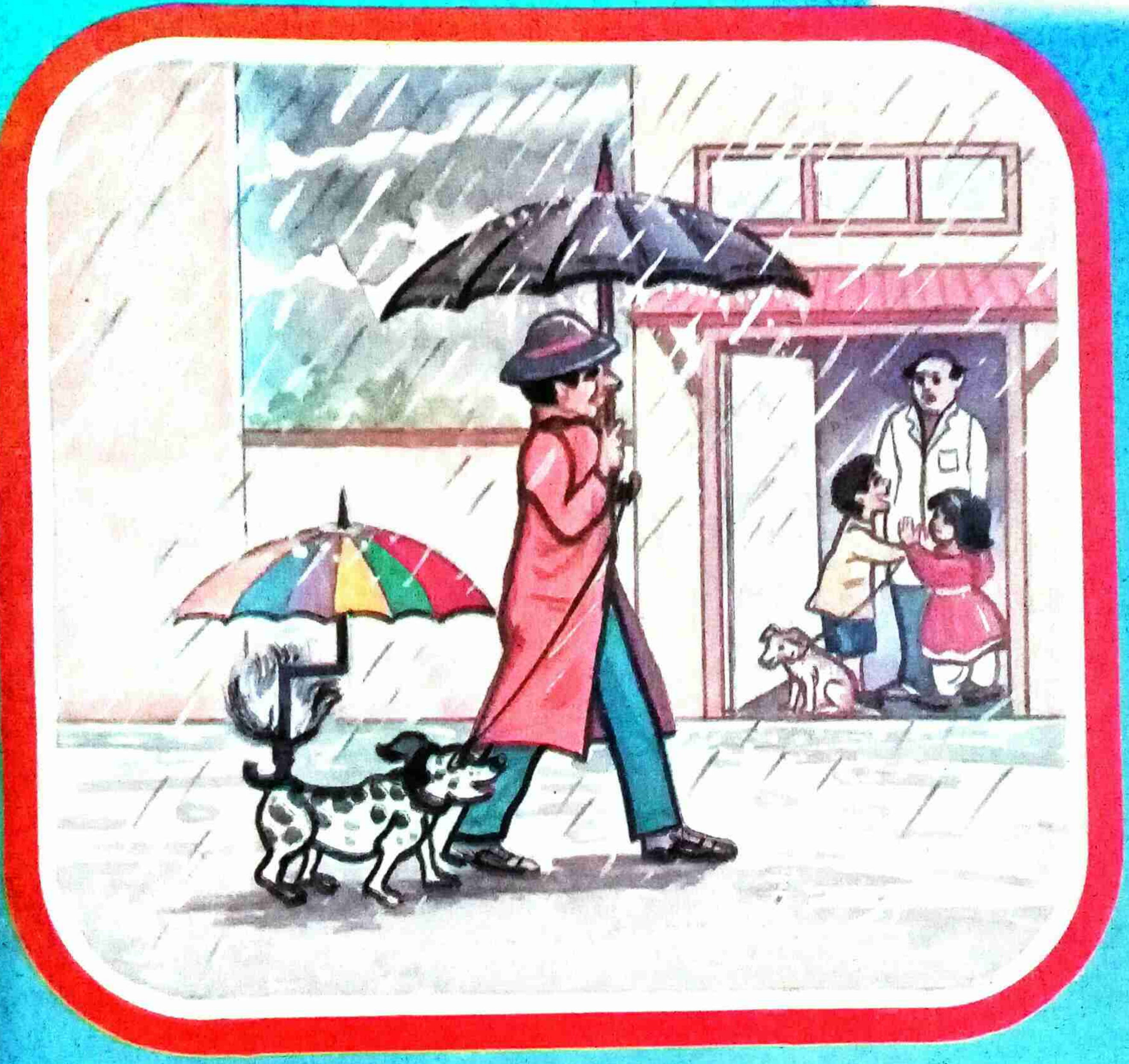

مئی 2003ء کے "بلاعنوان کارٹون" کے لیے بے شمار عنوان موصول ہوئے جن میں سے جج صاحبان کو مندرجہ ذیل 6 عنوانات پسند آئے اور ان کے مطابق یہ 6 ساتھی انعام کے حق دار قرار پائے۔

☆ طوبیٰ فاطمہ، کراچی ("واہ کیا شان ہے، تنکے میں جان ہے": پہلا انعام: 100 روپے کی کتابیں)

☆ شمائلہ ساجد، لاہور ("کیا پدی کیا پدی کا شوربہ" دوسرا انعام: 95 روپے کی کتابیں)

☆ آسیہ حسن، بہاولنگر ("ڈھول کا پول" تیسرا انعام: 90 روپے کی کتابیں)

☆ عائشہ کنزہ، منڈی بہاؤالدین ("موٹا اندر سے پھوکا" چوتھا انعام: 80 روپے کی کتابیں)

☆ آصف جاوید، کوہاٹ ("چیونٹی لگی ہاتھی کو گرانے!" پانچواں انعام: 75 روپے کی کتابیں)

☆ فارینا تحریم، راولپنڈی ("موٹا آلو پلپلا" چھٹا انعام: 60 روپے کی کتابیں)